ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

دشمن کو معاف کر دینا ——————
انتقام لینے کا سب سے کامیاب طریقہ ہے
اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو ——————
کامیابی کے اس راز کو جانتے ہوں

جولائی ۱۹۸۷

شمارہ ۱۲۸

شمارہ ۱۲۸ — جولائی ۱۹۸۷

فہرست

ماہانہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 611128 697333

کتنا فرق

مکی دور کا واقعہ ہے۔ قریش کے مشرک سردار ولید بن مغیرہ کے پاس جمع ہوئے۔ انھوں نے مشورہ کیا کہ ہم محمدؐ کے بارے میں لوگوں سے کیا کہیں۔

کسی مشرک نے کہا کہ ہم یہ کہیں کہ وہ کاہن ہیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ خدا کی قسم وہ کاہن نہیں۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ ان کے یہاں نہ کاہنوں کا گنگنانا ہے اور نہ کاہنوں کی قافیہ پیمائی ہے۔ کسی نے کہا کہ ہم ان کو دیوانہ بتائیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ خدا کی قسم وہ دیوانہ نہیں۔ ہم نے دیوانوں کو دیکھا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ دیوانے کیسے ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ ہم ان کو شاعر کہیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی تمام قسمیں رجز، ہزج، قریض، مقبوض، مبسوط سے واقف ہیں۔ ان کا کلام شعر بھی نہیں۔ کسی نے کہا کہ ہم ان کو جادوگر بتائیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ وہ جادوگر بھی نہیں ہیں۔ ہم نے جادو کو اور جادوگروں کو دیکھا ہے۔ ان کے یہاں نہ جادوگروں کی طرح پھونکنا ہے نہ ان کی طرح گرہیں لگانا۔

لوگوں نے کہا پھر اے ابو عبد شمس، آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کہیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ خدا کی قسم یہ بات نہیں۔ اور ان میں سے جو بات بھی تم کہوگے تو ضرور ان کا جھوٹ ہونا ظاہر ہو جائے گا (وما انتم بقائلین من ھذا شیئاً الا عرف انہ باطل، سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۸۴)

عرب کے مشرک سردار یہ جانتے تھے کہ وہ اپنے حریف (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف کچھ کہیں تو لوگ اسی وقت اس کو مانیں گے جب کہ وہ مطابق واقعہ ہو۔ اگر ان کی بات واقعہ کے خلاف ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف اور دشمنی کے باوجود کوئی اس کو نہیں مانے گا۔ یہ عرب کے مشرکین کا کردار تھا۔ آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے بڑے اگر کسی کے خلاف ایک بات کہہ دیں تو ان کے حلقہ کے لوگ فوراً اس کو مان کر دہرانے لگتے ہیں خواہ وہ بات نہ واقعہ کے مطابق ہو اور نہ کہنے والے نے اس کی نقلی یا عقلی دلیل پیش کی ہو۔

اختلاف کے باوجود

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ راشد تھے۔ آخر عمر میں بعض جھوٹی خبروں کی بنا پر مصر کے ایک ہزار سے زیادہ آدمی مدینہ آئے۔ انھوں نے مدینہ پہونچ کر کافی شور و غل کیا اور آخر کار حضرت عثمان کے مکان کو گھیر لیا۔ اگرچہ حضرت عثمان کے خلاف ان کا الزام سراسر بے بنیاد تھا، مگر یہ مسلمان آپ سے اتنا برہم ہوئے کہ آپ کا گھر سے نکلنا اور گھر میں پانی جانا بند کر دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ھ کو حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ بوقت وفات آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔

حضرت عثمان کا محاصرہ تقریباً ۴۰ دن تک جاری رہا تھا۔ بلوائیوں نے جب حضرت عثمان کو گھیر لیا اور مکان سے نکلنے پر پابندی لگا دی تو آپ کے لیے مسجد جانا ممکن نہ رہا۔ خلیفہ کی حیثیت سے نمازوں کی امامت آپ ہی فرماتے تھے۔ جب آپ کا مسجد جانا بند ہو گیا تو بلوائیوں کا سردار غافقی بن حرب عکی امام بن گیا۔ اس نے مدینہ کی مسجد میں نمازوں کی امامت شروع کر دی۔

یہ مدینہ کے مسلمانوں کے لیے بڑی سخت آزمائش کی بات تھی۔ ایک طرف وہ اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں، دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص جو کھلا ہوا مفسد اور غلط کار ہے، وہی مسجد کا امام بنا ہوا ہے۔ اس نازک حالت میں ایک شخص حضرت عثمان سے ملا اور ان سے پوچھا کہ ایسی حالت میں ہم کیا کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی کہ تم لوگ اس کے پیچھے نماز ادا کرو۔ آپ نے فرمایا:

اذا احسنوا فاحسن معهم وان اساؤا فاجتنب اساءتهم	جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں تو اس میں ان کا ساتھ دو اور جب وہ لوگ کوئی برا کام کریں تو ان کی برائی سے دور رہو۔

خلیفہ راشد کے اس واقعہ میں عظیم الشان نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص سے ہمیں خواہ کتنی ہی زیادہ شکایت ہو، اس کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ انصاف پر قائم رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اختلاف کو حد کے اندر رکھنا چاہیے نہ یہ کہ اختلاف پیدا ہونے کے بعد ہم حد کے باہر نکل جائیں۔

ایک اقتباس

میں نے چند سال ہوئے اندور میں ٹیگور ہال میں پیامِ انسانیت پر تقریر کی۔ اس موقع پر آر ایس ایس کے لوگ اور دوسری جماعتوں کے لوگ موجود تھے۔ اگلے دن ایک وفد میری قیام گاہ پر آیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس میں آر ایس ایس کے لیڈر اور اس کے ذمہ دار ہیں۔ اور مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ "کل آپ کی تقریر سن کر ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ آپ کو اس ملک کی ہم سے زیادہ فکر ہے۔" میں اس تاثر اور شہادت کو اپنے ہی لیے نہیں پوری ملّتِ اسلامیہ کے لیے ایک بڑا اعتراف اور قابلِ فخر نہیں تو قابلِ شکر سند سمجھتا ہوں۔ ضرورت ہے کہ آپ کی ہر بات سے اس کا اظہار ہو اور یہاں کے شہری یہ سمجھیں کہ آپ کو اِس ملک کی اُن سے زیادہ فکر ہے۔ آپ کو دولت سے زیادہ ملک عزیز ہے۔ آپ کو یہ معاشرہ عزیز ہے۔ لوگوں کا عزت کے ساتھ، سکون کے ساتھ، امن وامان کے ساتھ رہنا آپ کو دولت کمانے سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جو مفقود ہوتا جارہا ہے۔ اب یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ لوگوں میں بھی یہ بات نہیں رہی۔ وہ بے تکلف اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے اس سطح پر آجاتے ہیں، اور وہ کام کر لیتے ہیں جس سے ملک خطرہ میں پڑجاتا ہے۔ معاشرہ بری طرح زوال کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ اور پوری پوری کمیونٹی بلکہ ملک کی اس عظیم آبادی میں اس صورتِ حال سے حقیقی طور پر مضطرب و بے چین ہونے والا، اور اپنی کمیونٹی، پارٹی فرقہ اور جماعت کی ملامت و تنقید یا مدح و تعریف سے بے پروا و بے نیاز ہو کر تنقید و احتساب کا فرض ادا کرنے والا اور خطرہ کا بگل بجانے والا دور دور نظر نہیں آتا۔

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

کھونے کے بعد بھی

اے پی (لندن) کی فراہم کردہ ایک خبر حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوئی ہے ـــــــ
مسٹر اسٹینلی جاکی ہنگری میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک سیاہ پوش راہب، عیسائی عالم اور فزکس کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دس سال تک آواز سے محرومی ان کے لیے ان کی سائنس اور مذہب سے متعلق تحریروں پر دو لاکھ ۲۰ ہزار ڈالر جیتنے کا ذریعہ بن گئی۔ ۱۹۵۳ میں میرے گلے پر سرجری کے ایک حادثہ نے مجھے وقت دیا کہ میں لکھوں اور میں سوچوں۔ اور ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ بہت سے انتہائی مقبول کتابوں کے مصنف ایسے ہیں جو بالکل نہیں سوچتے، انھوں نے کہا۔ مسٹر جاکی جنھوں نے مذہب میں ترقی پر ٹمپلٹن انعام حاصل کیا ہے، یقین رکھتے ہیں کہ عیسائیت نے وہ ذہنی فضا پیدا کی جس نے سائنس کو ترقی کا موقع دیا۔ وہ اس خیال کے سخت ناقد ہیں کہ سائنس اور خدا ایک دوسرے سے غیر متعلق چیزیں ہیں:

> Mr Stanley L. Jali, a Hungarian-born Benedictine monk, theologian and physics professor, says losing his voice for ten years helped him win a $ 220,000 prize for his writings on science and faith. "A surgical mishap on my throat in 1953 gave me time to write and to think, and that's not always the case. Many writers of best-sellers don't think at all," the scholar said. Mr Jaki, who won the Templeton prize for progress in religion, holds that Christianity created the intellectual climate which allowed science to flourish. He is a stern critic of the view that science and God are unrelated.
> *The Times of India*, (New Delhi, May 14, 1987.

مسٹر جاکی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا کہ غلط آپریشن کی وجہ سے ان کی بولنے کی صلاحیت ختم ہوگئی۔ مگر ان کے سوچنے اور پڑھنے کی صلاحیت بدستور باقی تھی۔ انھوں نے اس بچی ہوئی صلاحیت کو بھرپور طور پر استعمال کیا۔ دس سال کی خاموش محنت سے انھوں نے ایک ایسی کتاب لکھی جس کا انعام سوا دو لاکھ ڈالر تھا۔ حادثہ کے بعد جو لوگ کھوئی ہوئی چیز کا غم کریں وہ صرف اپنی بربادی میں اضافہ کرتے ہیں۔ جو لوگ حادثہ پیش آنے کے بعد بچی ہوئی چیز پر اپنی ساری توجہ لگا دیں وہ از سر نو کامیابی کی منزل پر پہونچ جاتے ہیں۔

الرسالہ جولائی ۱۹۸۷

اعتراف

سید مشتاق علی کرکٹ کے انتہائی مشہور کھلاڑی ہیں۔ مسٹر شرد ورما نے ان سے انٹرویو لیا جو ہندستان ٹائمس (۱۵ مئی ۱۹۸۷) میں شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہماری کرکٹ کی تاریخ میں بہت کم افراد نے وہ غیر معمولی مقام حاصل کیا ہے جو سید مشتاق علی نے حاصل کیا۔ تقریباً بیس سال تک وہ کرکٹ کے ہیرو بنے رہے۔ ان کے متعلق سر کارڈوس (Sir Neville Cardus) نے کہا تھا کہ مشتاق گویا کہ ایک بازیگر ہے جو کامیابی حاصل کرنے کے لیے ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ اسی طرح کیتھ ملر (Keith Miller) نے کہا کہ وہ ہمارے وقت کے ناقابل یقین حد تک اچھے کھلاڑی ہیں۔

سید مشتاق علی کی شہرت ۱۹۳۰ میں شروع ہوئی جب کہ ان کی عمر صرف ۱۶ سال تھی۔ وہ اگرچہ کم کھیلتے تھے۔ مگر جب کھیلتے تھے تو ان کا کھیل سب سے زیادہ ممتاز ہوتا تھا۔ ۴۶-۱۹۴۵ میں کلکتہ میں آسٹریلیا کی ٹیم اور ہندستان کی ٹیم کا مقابلہ تھا۔ سید مشتاق علی کو ہندستان کی ٹیم سے خارج کر دیا گیا۔ اس پر کلکتہ میں زبردست مظاہرے ہوئے اور ہر طرف یہ نعرہ گونج اٹھا:

No Mushtaq, No Test

آخر کار منتظمین نے سید مشتاق علی کو ٹیم میں شامل کیا۔ اب سید مشتاق علی کی عمر ۷۲ سال ہو چکی ہے۔ مسٹر شرد ورما سے اپنے حالات بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک بار انگلینڈ میں ہندستانی اور انگریزی ٹیم کا مقابلہ تھا۔ انگریزی ٹیم کے کپتان ویلی ہمنڈ (Wally Hammond) تھے۔ سید مشتاق علی نے رن بنانے شروع کیے۔ یہاں تک کہ وہ نوّے سے آگے بڑھ گیے۔ ویلی ہمنڈ اگرچہ مخالف ٹیم کے کپتان تھے، وہ اپنے جذبہ اعتراف کو روک نہ سکے۔ انھوں نے تیزی سے آکر مشتاق علی کا کندھا تھپتھپایا اور کہا کہ جمے رہو، میرے بیٹے جمے رہو، اپنا سو پورا کرو:

Steady, my boy, steady, get your hundred first.

مردہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت بے اعترافی ہے اور زندہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت اعتراف۔ زندہ انسان کے سامنے ایک حقیقت آئے یا وہ ایک خوبی کا مشاہدہ کرے تو وہ اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا، خواہ یہ اعتراف اپنی ہار ماننے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

ابتدائی عمل

کپڑے کی صنعت سے جو بے شمار کام متعلق ہیں ان میں سے ایک اہم کام کپڑے کی رنگائی ہے۔ مثلاً بہت سی ساڑیاں ابتداءً کپاس کے سادہ رنگ میں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ان پر رنگ چڑھا کر ان کو جاذب بنایا جاتا ہے۔ رنگائی کا یہ کام اس طرح نہیں ہوتا کہ بنی ہوئی ساڑی کو لے کر رنگ کے حوض میں ڈال دیا۔ اگر ایسا کیا جائے تو کبھی اچھا رنگ نہیں آئے گا۔ رنگائی کرنے سے پہلے سادہ ساڑی کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ تیاری کے اس عمل کی تکمیل کے بعد ہی کپڑا اس قابل ہوتا ہے کہ اس کو رنگائی کے آخری مرحلہ میں داخل کیا جائے۔

اس پیشگی عمل کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً کپڑے کو نرم کرنا، داغ دھبہ مٹانا، اس کو سفید بنانا۔ اس سے کپڑے کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ رنگ کو زیادہ سے زیادہ جذب کر سکے۔ ان پیشگی تیاریوں کا بعد کی رنگائی اور چھپائی سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ یہ معلوم کیا گیا ہے کہ رنگے ہوئے کپڑوں کی ۷۰ فی صد خرابیوں کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ابتدائی کپڑے کو ناقص طور پر تیار کیا گیا تھا:

These pretreatments have a major role on subsequent dyeing, printing and finishing of cotton fabrics. In fact, it has been reported that 70% of all the defects occurring on dyed-finished fabrics could be attributed to the imperfect preparation of the base fabrics.

Monthly COLOURAGE, December 1, 1983

کپاس اور کپڑے کا یہ مزاج براہِ راست خداوند عالم کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یہ ایک عالمی قانون ہے جس سے موافقت کر کے انسان اپنی پسند کے کپڑے تیار کرتا ہے۔ اس طرح گویا خدا نے ایک نشانی قائم کر دی ہے جو بتا رہی ہے کہ زندگی کی تعمیر کے لیے ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ زندگی کی تعمیر میں بھی ضروری ہے کہ پہلے تیاری کے مراحل طے کیے جائیں۔ تیاری کی شرطیں پوری کرنے کے بعد ہی وہ وقت آتا ہے جب کہ اگلے مرحلہ کی طرف پیش قدمی کی جائے اور وہ کامیابی حاصل کی جائے جو مطلوب ہے۔ ابتدائی مراحل طے کیے بغیر کبھی آخری منزل نہیں آتی۔

الرسالہ جولائی ۱۹۸۷

سیاسی خواب

پنڈت جواہر لال نہرو کی مشہور کتاب ہے جس کا نام ہے ہندستان کی دریافت (The Discovery of India) یہ کتاب انھوں نے ۱۹۴۴ میں قلعہ احمد نگر کی اسیری کے زمانہ میں لکھی تھی۔ کتاب کو اشاعت کے لیے دیتے ہوئے اس کی آخری سطریں انھوں نے ۲۹ دسمبر ۱۹۴۵ کو الہ آباد میں لکھی تھیں جو کتاب کے خاتمہ پر شامل ہیں۔ اس تحریر کا آخری پیراگراف یہ تھا:

> We are on the eve of general elections in India and these elections absorb attention. But the elections will be over soon — and then? The coming year is likely to be one of storm and trouble, of conflict and turmoil. There is going to be no peace in India or elsewhere except on the basis of freedom (p. 568).

ہم ہندستان کے عام انتخابات کے عین قریب ہیں۔ اس الکشن نے توجہات کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ مگر الکشن جلد ہی ختم ہو جائیں گے ـــــــ پھر اس کے بعد۔ آنے والا سال کش مکش اور اضطراب کے طوفانوں کا سال ہوگا۔ ہندستان یا دوسرے مقامات پر امن صرف آزادی ہی کی بنیاد پر آسکتا ہے۔

ان سطروں کو لکھنے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہندستان نے آزادی حاصل کرلی۔ اور خود نہرو کو اپنی آخر عمر تک بلا شرکت ملک پر حکومت کرنے کا موقع ملا۔ ان کے بعد بھی ان کے قریب ترین تربیت یافتہ افراد ملک کے اقتدار پر قابض رہے۔ مگر وہ چیز جس کو امن کہا جاتا ہے وہ آج اس سے بھی زیادہ دور ہے جتنا وہ دسمبر ۱۹۴۵ میں نظر آتا تھا۔ ہندستان کو آزادی مل گئی۔ مگر اس کو امن حاصل نہ ہو سکا۔

پُرجوش لیڈر اکثر سیاسی تبدیلی کو حالات کی تبدیلی کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ سیاسی تبدیلی صرف حکومتی افراد کی تبدیلی ہے۔ اس کا حقیقی حالات کی تبدیلی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ سیاسی انقلاب صرف اس وقت مفید ہوتا ہے جب کہ اس سے پہلے اخلاقی انقلاب لایا جا چکا ہو۔ افراد کے اندر اخلاقی انقلاب لائے بغیر سیاسی انقلاب کے کوئی معنی نہیں۔

عظمتِ انسانی

اسلام کی تاریخ، ایک اعتبار سے، انسانی عظمت کی تاریخ ہے۔ اسلام نے ان اوصاف کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کی ہیں جن کو انسانی اوصاف کہا جاتا ہے۔ یہاں ہم اس بات کی وضاحت کے لیے چند مثالیں نقل کریں گے۔

اعتماد و توکل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تبلیغ کے تقریباً بارہ سال اسی شہر میں گزارے۔ اس زمانہ میں مکہ پر مشرکوں کا غلبہ تھا۔ انھوں نے آپ کو سخت تکلیفیں پہونچائیں۔ یہاں تک کہ آپ کو مار ڈالنے کے درپے ہوگیے۔ جب یہ نوبت آگئی تو آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گیے۔

اس وقت حالات اتنے سخت تھے کہ مکہ سے نکل کر سیدھے مدینہ جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے آپ جب مکہ چھوڑ کر نکلے تو ابتداءً تین دن تک غار ثور میں مقیم رہے جو ایک دشوار گزار پہاڑ کے اوپر ایک تنگ مقام پر واقع تھا۔ تاہم آپ کے دشمن آپ کو تلاش کرتے ہوئے وہاں بھی پہونچ گیے۔ آپ اپنے رفیق حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ غار میں تھے اور آپ کے دشمن تلواریں لیے ہوئے غار سے اتنے قریب کھڑے ہوئے تھے کہ آپ ان کے قدموں کو دیکھ سکتے تھے۔ تمام ظاہری قرائن کے مطابق ہلاکت آپ کے بالکل قریب پہونچ چکی تھی۔ حضرت ابو بکر صدیق کو یہ صورت حال دیکھ کر سخت تشویش ہوئی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وہ تو یہاں بھی آگیے۔ آپ نے نہایت سکون کے ساتھ جواب دیا: یا ابا بکر ماظنک باثنین اللہ ثالثھما (اے ابو بکر تمہارا ان دو کے بارے میں کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہو)

یہ فقرہ بلاشبہ توکل واعتماد کا انتہائی کامل نمونہ ہے۔ اس واقعہ میں انسان توکل کے اس آخری مقام پر نظر آتا ہے جس کے آگے اس اعلیٰ انسانی صفت کا کوئی درجہ نہیں۔

معبود کی یکتائی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں مدینہ میں ہوئی۔ اس وقت لوگوں کے اوپر عجیب دیوانگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ بہت سے لوگوں کو یہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ آپ کا انتقال ہوسکتا

ہے یا انتقال ہوگیا ہے۔ حضرت عمر فاروق اس معاملہ میں سب سے آگے تھے۔ وہ مدینہ کی مسجد نبوی میں تلوار لے کر کھڑے ہوگیے اور کہنے لگے کہ جو شخص کہے گا کہ رسول اللہ کی وفات ہوگئی ہے میں اس تلوار سے اس کی گردن مار دوں گا۔

مسجد نبوی میں زبردست خلفشار جاری تھا۔ لوگ سخت مبہوت نظر آرہے تھے۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق وہاں آئے۔ انھوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس کے بعد مسجد کے ایک طرف تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوگیے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے یہ تاریخی جملہ کہا: من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللّٰہ فان اللّٰہ حی لا یموت (جو شخص محمد کی عبادت کرتا تھا تو محمد کا انتقال ہوگیا اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے۔ اس پر کبھی موت آنے والی نہیں)

اس واقعہ میں انسان معرفت الٰہی کے آخری درجہ پر نظر آتا ہے۔ انسان انسان ہے اور خدا خدا ہے۔ اس حقیقت کو جاننا ہی اصل علم ہے۔ اور یہ واقعہ اس اصل علم کی آخری شاندار مثال ہے۔

حق کے آگے ڈھ پڑنا

اوپر جو واقعہ نقل کیا گیا اس موقع پر حضرت عمر فاروق کا کردار ابتداءً بے حد انتہا پسندانہ تھا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پیغمبر اسلام کا جسم بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ مگر انھیں یقین نہیں آیا کہ یہ آپ کی وفات کا واقعہ ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ ایک قسم کی روحانی معراج کا واقعہ ہے آپ اپنے رب کے پاس گیے ہیں اور جلد ہی دوبارہ زمین پر واپس آئیں گے۔

وہ اس معاملہ میں کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے حتی کہ حضرت ابوبکر صدیق کی بھی نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے مسجد نبوی میں داخل ہو کر ان کو چپ ہونے کے لیے کہا۔ مگر وہ چپ ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ان کا ہاتھ تلوار کے دستہ پر تھا اور ان کی زبان بے تکان بولے چلی جارہی تھی۔ یہ لمحہ تھا جب کہ حضرت ابوبکر صدیق مسجد نبوی میں تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے حضرت عمر فاروق کی آواز پر اپنی آواز کو تیز کرتے ہوئے اپنی تقریر شروع کر دی۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق تقریر کرتے ہوئے اس آیت تک پہونچے: وَمَا محمّد الاّ رسول قد خلت من قبلہ الرسل افا مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیہ فلن یضرّ اللّٰہ شیئاً وسیجزی

اللّٰہ الشاکرین ۔ (محمد تو صرف ایک رسول ہیں ۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں ۔ اگر وہ مرجائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے ۔ اور جو شخص الٹے پاؤں پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو ضرور بدلہ دے گا ۔

قرآن کی اس آیت کا سننا تھا کہ فوراً حضرت عمر فاروق ٹھنڈے ہو گیے ۔ بعد کے زمانہ میں انھوں نے اپنا اس وقت کا حال بتاتے ہوئے کہا : وقعتُ علی الارض وماتحملنی رجلای (میں زمین پر گر پڑا ، میرے پاؤں میرا بوجھ نہ سنبھال سکے)

اس واقعہ میں انسان عبدیت کے آخری مقام پر نظر آتا ہے ۔ عبدیت یہ ہے کہ انسان خدا کے آگے ڈھ پڑے ۔ حضرت عمر فاروق یہی انسان ثابت ہوئے ۔ وہ خدا کا کلام سن کر بالکل لفظی طور پر زمین پر گر پڑے ۔ اپنی رائے کو انھوں نے اپنے دماغ سے اس طرح نکال دیا جیسے کہ وہ ان کے دماغ میں کبھی تھی ہی نہیں ۔

حقیقت پسندی

حضرت حسن حضرت علی کی شہادت کے بعد خلیفہ مقرر ہوئے ۔ وہ اسلامی تاریخ کے پانچویں خلیفہ تھے ۔ انھیں تمام شرعی اور اخلاقی اصولوں کے مطابق خلافت پر قائم رہنے کا حق حاصل تھا ۔ مگر جب انھیں خلافت ملی تو صورت حال یہ تھی کہ حضرت امیر معاویہ جو اس وقت شام کے حاکم تھے ، انھوں نے خلافت سے باقاعدہ بغاوت کر دی ۔ خونِ عثمان کا بدلہ لینے کے نام پر انھوں نے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ کر لیا ۔

حضرت حسن بن علی نے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ چالیس ہزار کی فوج ان کے ساتھ ہے اسی طرح حضرت امیر معاویہ کے ساتھ بھی تقریباً اتنے ہی آدمی تھے ۔ یہ دونوں فوجیں جوش وجذبہ سے بھری ہوئی تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کے لیے بے قرار تھیں ۔ مگر حضرت حسن نے سوچا کہ یہ دونوں کے دونوں مسلمان ہیں ۔ جنگ کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان آپس میں لڑیں ۔ وہ قیمتی افراد جو اسلام کے جھنڈے کے نیچے اس لیے جمع ہوئے تھے کہ وہ دنیا سے شرک کا خاتمہ کریں وہ خود اپنے آپ کو اور اسی کے ساتھ اسلامی تاریخ کو ختم کر ڈالیں گے ۔

حضرت حسن کی حیثیت جائز خلیفۂ اسلام کی تھی ۔ جب کہ امیر معاویہ کی حیثیت یقینی طور پر

باغی کی تھی مگر حضرت حسن نے بجا طور پر یہ اندازہ لگایا کہ حضرت امیر معاویہ کسی قیمت پر جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں لڑائی کو جاری رکھیں گے خواہ اس کا نتیجہ مسلم سپاہیوں کی عام بربادی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حضرت حسن نے خود اپنے آپ کو جھکانے پر راضی کر لیا۔ مسلمانوں کو باہمی قتل وخون سے بچانے کے لیے انھوں نے یک طرفہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔

یہ حقیقت پسندی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ یہاں انسان حقیقت پسندی کی اعلیٰ ترین سطح پر نظر آتا ہے، وہ سطح جہاں انسان اپنے آپ کو حذف کر کے سوچ سکتا ہے۔ حضرت حسن نے اپنے آپ کو حذف کر کے سوچا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو راضی کر سکے جس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

احترام انسانیت

خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں حضرت عمرو بن العاص مصر کے گورنر تھے۔ انھوں نے ایک بار گھوڑوں کی دوڑ کرائی۔ اس دوڑ میں گورنر کے بیٹے کا گھوڑا بھی شریک تھا۔ مگر جب دوڑ ہوئی تو ایک مصری (غیر مسلم) کا گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ مصری نے فتح کے جوش میں کوئی ایسا جملہ کہا جو گورنر کے صاحبزادے (محمد بن عمرو بن العاص) کو برا معلوم ہوا اور انھوں نے مذکورہ مصری کو کوڑے سے ماردیا۔ مارتے ہوئے ان کی زبان سے نکلا: خذها وانا ابن الاکرمین (یہ لو، اور میں شریفوں کی اولاد ہوں)

حضرت انس بن مالک اس قصہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصری (غیر مسلم) مصر سے چل کر مدینہ پہونچا اور خلیفہ ثانی عمر فاروق سے شکایت کی کہ گورنر کے لڑکے نے اس طرح اس کو کوڑے سے مارا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو۔ اور فوراً اپنے ایک خاص آدمی کو مصر بھیجا کہ عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے محمد بن عمرو جس حال میں ہوں اسی حال میں ان کو لے کر مدینہ آؤ۔ چنانچہ وہ لوگ لائے گیے۔ جب وہ مدینہ پہونچے تو حضرت عمر نے فرمایا: این المصری، دونك الدرة فاضرب بها ابن الاکرمین (مصری کہاں ہے۔ یہ کوڑا لو اور اس سے شریف زادہ کو مارو)

اس کے بعد مصری نے کوڑا لیا اور گورنر مصر کے سامنے ان کے صاحبزادہ کو مارنا شروع کیا۔ وہ مارتا رہا، یہاں تک کہ ان کو زخمی کر دیا۔ حضرت عمر درمیان میں کہتے جاتے تھے کہ شریف زادہ کو مارو جب وہ خوب مار چکا تو حضرت عمر فاروق نے کہا کہ ان کے والد عمرو بن العاص کے سر پر بھی مارو ما

کیوں کہ خدا کی قسم ان کے بیٹے نے صرف اپنے باپ کی بڑائی کے زور پر تم کو مارا تھا ۔ (فواللہ ما ضربک ابنہ الا بفضل سلطانہ)

مصری نے کہا کہ اے امیر المومنین، جس نے مجھ کو مارا تھا اس کو میں نے مار لیا۔ اس سے زیادہ کی مجھے حاجت نہیں ۔ حضرت عمر نے کہا: خدا کی قسم اگر تم ان کو بھی مارتے تو ہم تمہارے اور ان کے درمیان حائل نہ ہوتے، یہاں تک کہ تم خود ہی ان کو چھوڑ دو ۔ پھر آپ نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر فرمایا: یا عمرو، متی تعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارا (اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا)

یہ واقعہ انسانی احترام اور انسانی برابری کی آخری اعلیٰ مثال ہے ۔ اس واقعہ نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ہر قسم کے فرق کو عملاً ختم کر دیا ۔ اس نے انسانی عدل و انصاف کی ایسی نظیر قائم کر دی جس کے آگے انسانی عدل و انصاف کا کوئی اور درجہ نہیں ۔

بے غرضی

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں قحط پڑا اور لوگ سخت پریشان ہو گئے ۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ نہ گھبراؤ۔ اللہ جلد ہی تمھارے لئے کشادگی کی صورت پیدا کر دے گا ۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ شام سے آیا ، اس میں ایک ہزار اونٹ تھے اور سب کے سب گیہوں اور کھانے کی چیزوں سے لدے ہوئے تھے ۔ یہ خبر مدینہ میں پھیلی تو شہر کے تاجر عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے ۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ وہ باہر آئے ۔ ان کے پاس ایک چادر تھی جس کو وہ اپنے کندھے پر اس طرح ڈالے ہوئے تھے کہ اس کا ایک سرا سامنے کی طرف لٹک رہا تھا اور دوسرا سرا پیچھے کی طرف ۔

عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم لوگ کیوں آئے ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو ۔ تاجروں نے کہا: ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ کے پاس ایک ہزار اونٹ گیہوں اور غذائی سامان آیا ہے ۔ ہم ان کو خریدنا چاہتے ہیں ۔ آپ ہمارے ہاتھ یہ غذائی سامان بیچ دیں تاکہ ہم اس کو مدینہ کے ضرورت مندوں تک پہنچا سکیں ۔
عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا ۔ اندر آؤ اور گھر میں بیٹھ کر بات کرو ۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ غذائی اشیاء کے ایک ہزار ڈھیر گھر کے اندر پڑے ہوئے ہیں ۔

اب بات چیت شروع ہوئی ۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میری شام کی خریداری پر تم مجھ کو کتنا زیادہ

نفع دو گے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر بارہ درہم۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر چودہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا اچھا دس درہم پر پندرہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو اس سے بھی زیادہ مل رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کون آپ کو اس سے زیادہ دے رہا ہے۔ جب کہ مدینہ کے جتنے تاجر ہیں سب یہاں جمع ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو ہر ایک درہم کے بدلے دس درہم مل رہا ہے۔ پھر کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو۔ انھوں نے کہا نہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی کتاب پاک میں فرمایا ہے کہ جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لئے اس کا دس گنا بدلہ ہے (انعام ۱۶۰) تو اے مدینہ کے تاجرو، گواہ رہو کہ میں نے یہ تمام غذائی سامان اللہ کے لئے شہر کے ضرورت مندوں پر صدقہ کر دیا (العبقریات الاسلامیہ صفحہ ۵۷۲)

یہ واقعہ خدا کے وعدہ پر یقین کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ خدا پر ایمان آدمی کے اندر اسی قسم کا یقین واعتماد پیدا کرتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اس قسم کا یقین واعتماد پیدا ہو جائے وہ اغراض ومصالح سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اس کے حوصلے اتنا زیادہ بلند ہو جاتے ہیں کہ اس کے بعد بڑی سے بڑی قربانی بھی اس کے لیے مشکل چیز نہیں رہتی۔

عدل وانصاف

حضرت عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱- ۶۲ ھ) پانچویں خلیفہ راشد ہیں۔ آپ کے خادم ابوامیہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز آپ کی اہلیہ سے کہا کہ مسور کی دال کھاتے کھاتے میرا برا حال ہوگیا ہے۔ خاتون نے جواب دیا: تمھارے خلیفہ کا بھی روز کا کھانا یہی ہے۔ آپ سے پہلے خلیفہ کی حفاظت کے لئے ایک سو سپاہی مقرر تھے، جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے سب کو دوسرے سرکاری کاموں میں لگا دیا اور فرمایا: میری حفاظت کے لئے قضاد قدر ہی کافی ہے۔ یہ اس شخص کا حال تھا جس کی سلطنت کے حدود سندھ سے لے کر فرانس تک پھیلے ہوئے تھے۔

آپ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ سمرقند کے باشندوں کا ایک وفد آیا۔ اس نے ایک فوجی سردار قتیبہ بن مسلم باہلی کے بارے میں یہ شکایت کی کہ اسلامی قاعدہ کے مطابق انھوں نے ہم کو پیشگی تنبیہ نہیں کی اور ہمارے شہر میں اچانک اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ لہذا ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے ہوئی تھی۔ اور اب اس پر سات سال گزر چکے تھے۔ مگر آپ نے انصاف کے

تقاضے کو پورا کرنا ضروری سمجھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے عراق کے حاکم کو لکھا کہ سمرقند کے لوگوں کے مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک خصوصی قاضی مقرر کریں۔ عراق کے حاکم نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جمیع بن حاضر الباہلی کو اس کا قاضی مقرر کیا۔ ان کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ دونوں فریق نے آزادانہ طور پر اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔ آخر میں قاضی نے سمرقند والوں کی شکایت کو درست قرار دیتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ ــــــــ

مسلمانوں کی فوج سمرقند کو چھوڑ کر باہر آجائے اور اہلِ سمرقند کو ان کا قلعہ اور تمام دوسری چیزیں واپس کر دی جائیں۔ اس کے بعد اسلامی قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کا فوجی سردار ان کے سامنے ضروری شرطیں پیش کرے۔ اگر وہ تمام شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیں تو پھر اس کے بعد ان سے جنگ کی جائے۔

اسلامی فوج اس وقت فاتحانہ حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے چین جیسے ملک کے بادشاہوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر جب قاضی نے اپنا فیصلہ سنایا تو اسلامی فوج کے سردار نے کسی بحث کے بغیر اس کو مان لیا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ پوری فوج سمرقند چھوڑ کر نکل آئے۔ تاہم اس پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی۔ سمرقند کے لوگوں نے جب دیکھا کہ مسلمان اس قدر با اصول اور انصاف پسند ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی ایسے بے لاگ انصاف کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلم فوج کا آنا ان کے لئے رحمت کا آنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے مسلم حکومت کو قبول کر لیا۔ وہ کہہ اٹھے: خوش آمدید، ہم آپ کے مطیع و فرماں بردار ہیں (مرحبا سمعنا و اطعنا، فتوح البلدان للبلاذری)

یہ واقعہ عدل و انصاف کا جو نمونہ پیش کر رہا ہے۔ اس کی مثال ساری تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اس واقعہ میں عدل و انصاف کا اصول اپنے آخری اعلیٰ مقام پر نظر آتا ہے۔ عدل بلاشبہ انسانی زندگی کی بلند ترین قدر ہے، اور یہ واقعہ اس قدر کے اعتراف کی بلند ترین عملی مثال۔

دورِ جدید کی تحریکیں

موجودہ زمانہ میں مختلف مسلم ملکوں میں بہت سی بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں جو اپنے دعوے کے مطابق تجدید کی تحریکیں تھیں۔ مزید یہ کہ ان تحریکوں کو بہت بڑی مقدار میں ساتھ دینے والے افراد بھی ملے اور مادی وسائل بھی، حتیٰ کہ اس سے بھی زیادہ جتنا قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو ملے تھے۔ اس کے باوجود یہ تحریکیں عملی طور پر سراسر بے نتیجہ رہیں۔ وہ اُس منزل پر پہونچنے میں ناکام رہیں جس کو انھوں نے اپنا نشانہ بنایا تھا۔

ان تحریکوں کے معتقدین نے بطور خود اگرچہ بہت بڑے بڑے الفاظ پالئے ہیں جو وہ اپنی تحریک یا اپنی شخصیتوں کے بارہ میں بول سکیں۔ مگر یہ محض الفاظ ہیں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مثلاً سید ابو الاعلیٰ مودودی کے معتقدین موجودہ عہد کو "سید مودودی کا عہد" کہتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت لفظی بازیگری سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ میں نے ان حضرات سے کئی بار پوچھا کہ جس چیز کو آپ سید مودودی کا عہد کہتے ہیں وہ کہاں ہے تاکہ میں بھی وہاں جاکر اسے دیکھوں۔ کیا وہ سید ابو الاعلیٰ مودودی کے اپنے مکان میں ہے۔ کیا وہ اس شہر میں یا اس ملک میں ہے جہاں وہ رہتے تھے۔ کیا وہ اس جماعت میں ہے جس کو انھوں نے قائم کیا اور چلایا۔ اس کا جواب ان حضرات کے پاس کچھ نہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے اس محبوب تخیل (سید مودودی کا عہد) کو بدستور لکھے اور چھاپے چلے جا رہے ہیں ——— یہ مردہ قوم کی مخصوص علامت ہے کہ جس چیز کو وہ حقیقت میں نہ پائے اس کو وہ الفاظ میں پاکر کامیابی کا جشن مناتی ہے۔

موجودہ زمانہ کی تجدیدی تحریکوں کی ناکامی کی وجہ کیا تھی، اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ یہ تحریکیں تجدیدی تحریکیں تھیں ہی نہیں۔ تجدید دین، ابدیت کی بنیاد پر اٹھنے کا نام ہے، جب کہ ان مسلم مفکرین کے پاس آخری سرمایہ صرف یہ تھا کہ وہ وقتی مسائل سے متاثر ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تحریکیں دراصل ردعمل کی تحریکیں تھیں جن کو خوش خیال مفکرین نے بطور خود تجدیدی تحریک کا نام دے دیا۔

یہاں ہم اس سلسلہ میں صرف ایک مثال دیں گے۔ اسی مثال پر دوسرے مسلم مفکرین کو

قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ مثال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"مارچ ۱۹۳۷ میں جب میں دہلی گیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سیاسی حالات کے تغیر سے مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس قدر بھی طاقت خدا نے مجھے دی ہے اس کو اسی انقلاب کے مقابلہ میں صرف کروں۔ چنانچہ میں نے دہلی سے حیدر آباد پہونچتے ہی اس نئی مہم کی ابتدا ترجمان القرآن کے مضامین (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش) سے کر دی۔ آج کل میرے خیالات میں ایک ہلچل برپا ہے جس نے مجھے پرسکون تفکر کے قابل نہیں رکھا۔ دہلی سے ایک آگ اپنے سینہ میں لایا ہوں اور ہر لمحہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب کیا کروں۔ جو طوفان ہمارے سر پر آگیا ہے کیا وہ ہمیں اتنی فرصت دینے کے لیے تیار ہے کہ ہم اس طرح اطمینان سے بیٹھے ہوئے اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو از سرِ نو تیار کریں۔ ایک طرف ایک منظم طاقت ہے جو نیشنلزم اور ڈیماکریسی کے مجموعہ کو پراونشل اٹانومی کے زبردست وسائل سے ہندستانِ جدید کی تعمیر اس نقشہ پر شروع کر چکی ہے جس میں مسلمان قوم کے لیے بحیثیت مسلمان ہونے کے کوئی جگہ نہیں۔ دوسری طرف مسلمان ایک ریوڑ کی طرح ہندستان کے طول و عرض میں بھٹک رہے ہیں" (ملخصاً) حکمت قرآن (لاہور) ستمبر اکتوبر ۱۹۸۴

یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات واضح طور پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی حقیقتہً "واقعات انسانی" سے متاثر ہو کر اٹھے نہ کہ "واقعاتِ خداوندی" سے متاثر ہو کر۔ اور اسی کا نام ردعمل کی نفسیات کے تحت اٹھنا ہے۔ یہی معاملہ موجودہ زمانہ میں تمام مسلم رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم تحریکیں اٹھیں ان کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ ان کی پہلی قسم وہ ہے جو انیسویں صدی کے نصف ثانی میں ظاہر ہوئی۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو بیسویں صدی کے نصف اول میں پیدا ہوئی اور پھیلی۔

موجودہ زمانہ میں مغربی قومیں جدید قوتوں سے مسلح ہو کر ابھریں اور انھوں نے پوری دنیا کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مغلوب کر لیا۔ اس کی زد سب سے زیادہ مسلمانوں پر

پڑی۔ کیوں کہ مسلمان ہی اس وقت سب سے بڑی عالمی قوت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس عمل کی انتہا انیسویں صدی میں ہوئی۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ ہر مسلم ملک میں ایسے لوگ ابھرے جو ماضی کی عظمت کو دوبارہ واپس لانے کا پیغام دیتے تھے۔

سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷-۱۸۳۸) اور محمد علی جوہر (۱۹۳۱-۱۸۷۸) کو اس دور کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کی زندگی کے حالات پڑھیے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جس نے انھیں ابھارا اور عمل کے میدان میں کھڑا کیا وہ مغربی قوموں کا اسلامی ممالک پر غلبہ تھا۔ ان قوموں نے نہ صرف مسلم ملکوں کو سیاسی طور پر مغلوب کیا تھا بلکہ اسلامی آثار اور اسلامی امتیازات کو مٹانے کی ایک مسلسل مہم جاری کر دی تھی، اس صورت حال نے سید جمال الدین افغانی اور محمد علی جوہر جیسے لوگوں کو تڑپایا اور وہ مغربی قوموں سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گیے۔ باعتبار محرک وہ جوابی ذہن کے تحت ابھرے تھے نہ کہ مثبت ذہن کے تحت۔

دوسرے مرحلہ کی تحریکیں وہ ہیں جن کی نمائندگی سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹-۱۹۰۳) اور سید قطب شہید (۱۹۶۶-۱۹۰۶) جیسے لوگوں نے کی۔ اس دوسرے مرحلہ کے افراد کے حالات زندگی کو پڑھیے تو دوبارہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی سیاسی اور تہذیبی المیہ سے متاثر ہو کر ابھرے جس سے متاثر ہو کر پہلے مرحلہ کے لوگ ابھرے تھے۔ دونوں ہی یقینی طور پر رد عمل کی پیداوار تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے مرحلہ کے افراد نے اپنے رد عمل کو سادہ طور پر صرف رد عمل کے انداز میں پیش کیا اور دوسرے مرحلہ کے افراد نے اپنے رد عمل کے ساتھ وہ معاملہ کیا جس کو انگریزی میں "فیلو سوفائز" کرنا کہتے ہیں۔ یعنی انھوں نے اپنے رد عمل کو فکر اور فلسفہ بنا کر پیش کیا۔ انھوں نے اس کو ایک مستقل تعبیر کی حیثیت دے دی۔ پہلے مرحلہ کے لوگوں کا عمل اگر سیاسی دفاع تھا تو دوسرے مرحلہ کے افراد کا عمل سیاسی تعبیر۔

رد عمل کی نفسیات کے تحت اٹھنے والے آدمی کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ پیش نظر مسئلہ کو دیکھتا ہے نہ کہ اصل حقیقتِ واقعہ کو۔ اس کی نظر وقتی صورت حال پر ہوتی ہے نہ کہ ابدی صورت حال پر۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا۔ ان کی ردعمل کی نفسیات نے ان سے مثبت طرز فکر کو چھین لیا۔ ان کی پوری سوچ منفی سوچ بن گئی۔ جس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ ان کی تفکیر بھی صراط مستقیم سے ہٹ گئی اور ان کی عملی منصوبہ بندی بھی ۔ یہاں ہم اس معاملہ کے چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے ۔

۱۔ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

الا إن فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب ۔ (متفق علیہ)	آگاہ، جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے ۔ وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے ۔ وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے ۔ آگاہ، اور وہ قلب ہے ۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اصلاحی عمل کا مقام آغاز کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقامِ آغاز انسان کا دل ہے ۔ قلب (یا ذہن) کی اصلاح سے اعمال کی اصلاح ہوتی ہے ۔ جب بھی لوگوں کے اندر عمل کی کمی نظر آئے تو اس قول رسول کے مطابق ہمیں پیشگی طور پر یہ یقین کرنا چاہیے کہ اس کا سبب انسان کے قلب میں ہوگا ۔ عمل کا بگاڑ قلب کے بگاڑ کا نتیجہ ہے اور عمل کی اصلاح قلب کی اصلاح کا نتیجہ ۔

یہ نکتہ مخصوص نفسیات کی بنا پر ہمارے رہنماؤں سے اوجھل ہوگیا ۔ وہ اس راز کو سمجھنے میں ناکام رہے جو قرآن وحدیث میں اور رسول اللہ کی سیرت میں واضح طور پر موجود تھا ۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اپنے تجدیدی کام کا آغاز تجدید نظام سے کیا ۔ حالاں کہ تجدیدی کام کا صحیح آغاز یہ تھا کہ اس کو تجدید روح سے شروع کیا جاتا ۔

دور زوال میں ہمیشہ قوموں سے جو چیز غائب ہوتی ہے وہ اسلامی روح ہے ۔ اس لیے اسلامی روح کو از سرِ نو زندہ کرنا ہی تجدید دین کا پہلا کام ہے ۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے ذہن پر چوں کہ سیاسی نظام کے ٹوٹنے کا غم سمایا ہوا تھا اس لیے اپنی نفسیات کے تقاضے کے تحت انھوں نے یہ سمجھا کہ اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کو دوبارہ بحال کیا جائے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری کوششیں تجدید نظام کے محاذ پر وقف کر دیں ۔ مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے ایک ٹوٹے ہوئے گھر کو دوبارہ بنانے کے لیے یہ کیا جائے کہ اس کو بنیادوں اور دیواروں کے بغیر چھت کی طرف سے کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے ۔ ظاہر ہے کہ

ایسی چھت کبھی کھڑی نہیں ہوتی اور نہ ایسا مکان کبھی وجود میں آتا۔ چنانچہ بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان رہنماؤں کا تجدید نظام کا منصوبہ کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ مسلم رہنما اپنے ردعمل کی نفسیات کی بنا پر یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ "نظام اسلام" ہمیشہ روح اسلام کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں نظامِ اسلام کی بربادی اسی لیے ہوئی کہ مسلمانوں میں روحِ اسلام کمزور ہو گئی تھی۔ یہ رہنما اگر ردعمل کی نفسیات کا شکار نہ ہوتے تو ان کے لیے اس حقیقت کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ اور اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے تو وہ اپنے کام کا آغاز تجدیدِ روح سے کرتے نہ کہ تجدیدِ نظام سے، جس کا موجودہ اسباب کی دنیا میں کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں تھا اور نہ اس کا کوئی نتیجہ نکلا۔

۲۔ قرآن میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لائے گا جو تمہارے جیسے نہ ہوں گے۔ (فان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم) اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ مسلمانوں پر جب زوال طاری ہو تو ان کو دوبارہ زندہ اور فعال بنانے کی ایک ضروری تدبیر یہ ہے کہ ان کے اندر نئی قومیں داخل کی جائیں۔ گویا ان کے لیے وہ چیز فراہم کی جائے جس کو آج کل کی زبان میں نیا خون (New blood) کہا جاتا ہے۔

یہ قدرت کا ایک عالم گیر قانون ہے کہ ہر چیز پر تنزل طاری ہوتا ہے۔ ہر چیز ایک مدت گزرنے کے بعد اپنی ابتدائی قوت کھو دیتی ہے۔ یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ قوموں پر بھی آخر کار زوال آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا معاملہ بھی یہی تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان حقیقتہً ایک زوال یافتہ قوم تھے۔ وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ تنہا اپنی قوت سے اسلام کے حامل بن سکیں۔ ایسی حالت میں کرنے کا کام یہ تھا کہ مسلمانوں کی داخلی اصلاح کرتے ہوئے یکساں قوت کے ساتھ غیر مسلم اقوام میں اسلام کی دعوت پہونچائی جائے تاکہ ان کے اندر سے اسلام کی حمایت کے لیے نیا خون مل سکے۔

مگر یہاں دوبارہ مسلم رہنماؤں کی ردعمل کی نفسیات حائل ہو گئیں۔ وہ غیر مسلم اقوام کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف شدید نفرت میں مبتلا تھے۔ دعوتی عمل کی لازمی شرط مدعو کے حق میں محبت ہے مگر مسلمانوں کی ردعمل کی نفسیات نے ان کے لیے مدعو کو نفرت اور حقارت کا

موضوع بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ساری دل چسپیاں صرف مسلمانوں کی اصلاح کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے دور زوال کو پہونچ کر بالکل بے جان ہو چکے تھے مگر مسلم رہنماؤں کی خوش فہمی نے انھیں برعکس طور پر یہ دکھایا کہ :

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مسلمانوں کے بارہ میں اس اندازہ کی غلطی اس واقعہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ پچھلے سو برس کے اندر بے شمار اعاظم واکابر (بشمول اقبال) اس "مٹی" کو نم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے اس کو صرف "ذرا سا نم" نہیں کیا بلکہ اس کو جل تھل کر دیا۔ مگر مسلمانوں کے اندر سے وہ جاندار گروہ نہ ابھر سکا جو جدید تاریخ میں اسلام کو اس کا واقعی مقام دلانے والا بن سکے۔ حتیٰ کہ خود اقبال کو آخر میں یہ کہنا پڑا :

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

دورِ جدید کے مسلم رہنما اگر رد عمل کی نفسیات میں بتلا نہ ہوتے تو یقیناً وہ اس راز کو سمجھ لیتے کہ موجودہ زمانہ میں تجدید دین اور احیاء اسلام کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو غیر مسلم اقوام تک پہونچایا جائے تاکہ ان کی صفوں سے ایسے افراد حاصل ہوں جو نومسلمانہ جوش کے ساتھ اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔ مگر غیر مسلم اقوام میں دعوتی کام کرنے کے لیے ان کے حق میں محبت اور خیر خواہی کا جذبہ درکار تھا اور ہمارے رہنما رد عمل کی نفسیات کے نتیجہ میں پہلے ہی اس کو کھو چکے تھے۔ پھر وہ غیر مسلم اقوام کے درمیان خدا کے دین رحمت کے داعی بن کر اٹھتے تو کیسے اٹھتے۔

۳۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے، سب ان کی قوموں کی زبان میں بھیجے (وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ) اس آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ دعوتی کام کی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ مدعو کی اپنی زبان اور اس کے قابل فہم اسلوب میں ہو۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جس طرح دوسری چیزوں میں انقلاب آیا ہے اسی طرح زبان وادب میں بھی زبردست انقلاب آیا ہے۔ سائنس کے زیر اثر موجودہ زمانہ میں بالکل ایک نیا انداز بیان وجود میں آیا ہے۔ آج کا انسان اسی بات

کو اہمیت دیتا ہے جو جدید سائنسی اسلوب میں ڈھال کر اس کے سامنے پیش کی جائے۔ اور جو چیز سائنسی اسلوب میں ڈھلی ہوئی نہ ہو وہ جدید انسان کو اپیل نہیں کرتی، وہ اس کے دل ودماغ میں اپنی جگہ نہیں بناتی۔

اس صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ موجودہ زمانہ میں جدید اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے۔ جو وقت کے علمی اور ادبی اسلوب کے مطابق ہو۔ اس کی اہمیت غیر مسلم قوموں کے لیے بھی تھی اور خود مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بھی۔ مگر یہاں دوبارہ مسلمانوں کی ردعمل کی نفسیات رکاوٹ بن گئی۔ جدید علمی انداز یا نیا ادبی اسلوب پیدا کرنے والی قومیں عین وہی تھیں جن سے ہمارے مسلم رہنما نفرت میں مبتلا تھے۔ اور جن کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ان کی اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توجہ اور دل جمعی کے ساتھ جدید اسلوب کو سمجھنے کی کوشش نہ کر سکے۔ نتیجۃً وہ جدید اسلوب میں اسلامی لٹریچر پیش کرنے میں بھی ناکام رہے۔

دور جدید میں اسلام کے احیار اور تجدید کے کام کی یہ ایک بنیادی ضرورت تھی۔ مگر کتابوں کے ان گنت انبار کے باوجود یہ ضرورت ابھی تک غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ لوگوں کے اندر اس کا شعور تک موجود نہیں۔ میری ملاقات ایک مشہور حلقہ کے ایک صاحب سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلمان ابھی تک یہ نہ کر سکے کہ وہ وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی لٹریچر تیار کریں۔ انھوں نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ فلاں عظیم شخصیت نے یہ کام انجام دیدیا ہے۔ ان کی کتابیں وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کر رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ مذکورہ شخصیت سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ان سے چند سطریں صرف یہ لکھوا کر بھیج دیجئے کہ "وقت کا فکری مستویٰ" کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے۔ مگر آج تک ان کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

میں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے دور میں مسلمانوں کا دینی طبقہ کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکا جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔ شخصیتوں سے عقیدت رکھنے والے کسی خوش فہم دماغ میں ایسی کتابوں کا وجود ہو سکتا

ہے، مگر حقیقی دنیا میں ایسے لٹریچر کا وجود نہیں۔ اور اگر بالفرض کسی صاحب کو اصرار ہو کہ ایسی کتابیں موجود ہیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ایسی صرف ایک کتاب راقم الحروف کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ میں بتاؤں گا کہ اس کی حقیقت جدید اسلوب اور سائنٹفک طرز تحریر کے اعتبار سے کیا ہے، بشرطیکہ یہ کتاب کسی ذمہ دار شخص کی طرف سے ان کی اپنی تحریر کے ساتھ بھیجی گئی ہو۔

۱۹۸۰ میں میری ملاقات امریکہ کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص مسٹر اسٹیو اسکلر (Steve Sklar) سے ہوئی۔ وہ فلوریڈا کے ایک عیسائی خاندان میں ۱۹۴۷ میں پیدا ہوئے ان کو تقابلی مطالعہ کا شوق ہوا، اور انھوں نے تمام بڑے بڑے مذاہب سے متعلق کتابیں پڑھ ڈالیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں نے ان مسلم مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھے ہیں جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بڑے مفکر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ کتابیں میرے نزدیک بالکل کوڑا (Rubbish) ہیں۔ مغربی ملکوں میں ان کے ذریعہ سے اسلام کے تعارف کا کام نہیں کیا جا سکتا۔

انھوں نے کہا کہ یہ انگریزی ترجمے زبان کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ ان کی زبان جاندار زبان نہیں۔ تاہم اس سے قطع نظر مضمون کے اعتبار سے بھی ان کتابوں میں ایسی کمیاں ہیں کہ وہ مغربی انسان پر کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے چند باتیں بتائیں

انھوں نے کہا کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا مغرب کے خلاف شدید نفرت میں مبتلا ہے۔ وہ مغرب اور مغربی تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کے اس مزاج کی وجہ سے ان کی کتابیں غیر سائنٹفک ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہندو مفکرین کی کتابوں میں اپنے مخاطب کے لیے محبت کا جذبہ ملتا ہے مگر موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین کی کتابوں میں کم از کم مغربی مخاطب کے لیے نفرت اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں۔

چنانچہ ان کتابوں کی ایک کمی یہ ہے کہ ان میں غلط قسم کی تعمیم (Generalisation) پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ مغربی سوسائٹی سے کوئی منفرد اور استثنائی واقعہ لیں گے اور اس کو اس طرح بیان کریں گے گویا کہ یہی مغربی سوسائٹی کی عام حالت ہے۔ مثلاً ایک مسلم مصنف نے اپنی کتاب

میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص ایک مغربی خاتون کے گھر پر اس سے ملنے کے لیے گیا۔ اس نے گھنٹی بجائی، اس وقت مغربی خاتون غسل خانہ میں نہا رہی تھی۔ وہ گھنٹی کی آواز سن کر بالکل ننگی باہر نکل آئی۔ اس قسم کا واقعہ کوئی استثنائی واقعہ ہو سکتا ہے مگر یہی مغربی سوسائٹی کی عام حالت نہیں۔ ان مصنفین کا حال یہ ہے کہ وہ مغربی سوسائٹی کا کوئی برا واقعہ لیں گے اور اس کو مغربی سوسائٹی کی عام حالت بتائیں گے۔ دوسری طرف یہی لوگ اسلام کے بارہ میں یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کا ایک نہایت اچھا واقعہ منتخب کرتے ہیں اور اس کو اسلامی سوسائٹی کی عام حالت بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تقابل علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔

اسی طرح ان کتابوں میں ایک عام کمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں آئیڈیل کا تقابل پریکٹس سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً اسلام کے تصور مساوات کو بتانے کے لیے وہ خطبہ حجۃ الوداع کے الفاظ نقل کریں گے اور مغرب کے تصور مساوات کو بتانے کے لیے ساؤتھ افریقہ کی مثال دیں گے۔ حالاں کہ یہ تقابل سراسر غلط ہے۔ ان کو چاہیے کہ آئیڈیل کا تقابل آئیڈیل سے اور پریکٹس کا تقابل پریکٹس سے کریں۔ مثلاً پیغمبر کے حجۃ الوداع کی تقریر کا تقابل انھیں اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر سے کرنا چاہیے نہ کہ ساؤتھ افریقہ کی عملی صورت حال سے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مسٹر اسٹیو اسکلر کی مذکورہ نشاندہی بالکل درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید قومیں ہمارے مسلم رہنماؤں کے لیے نفرت اور حقارت کا موضوع بن گئیں۔ یہ ذہن اتنا عام ہوا کہ مسلمانوں کی غیر سیاسی شخصیتیں بھی اس نفسیات سے محفوظ نہیں رہیں۔ اس کی ایک عبرت ناک مثال وہ ہے جس کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۸۵-۱۹۰۸) نے نقل کیا ہے۔

مولانا ابوالبرکات عبد الرؤف دانا پوری نے سیرت نبوی پر اپنی کتاب "اصح السیر" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چوں کہ طبقات ابن سعد کو ایک عیسائی نے ایڈٹ کیا اور چھاپا ہے اور اس نے ضرور کتاب کے اصل مخطوطہ میں ردوبدل کیا ہوگا۔ اس لیے میرے نزدیک وہ معتبر اور قابل استناد نہیں ہے۔ اصح السیر میں یہ بات پڑھ کر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی طرف رجوع کیا جن کی نظر مخطوطات پر بڑی وسیع اور عمیق ہے۔ مولانا اعظمی نے جواب

میں تحریر فرمایا کہ طبقات ابن سعد کا اڈیشن جس مخطوطہ پر مبنی ہے، اس کو میں نے دیکھا اور مطبوعہ اڈیشن اور مخطوطہ دونوں کا حرفاً حرفاً مقابلہ کیا ہے اور کہیں ایک حرف کا فرق بھی نہیں پایا ہے (ماہنامہ برہان، دہلی جون ۱۹۸۲)

اس نفسیات کی بنا پر مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ جدید اسلوب یا جدید معیار ادب کو سمجھیں جن کو پیدا کرنے والی خود یہی قومیں تھیں۔ جدید قوموں سے نفرت مسلمانوں کے لیے اس میں مانع ہو گئی کہ وہ جدید اسلوب کو سمجھیں اور اس میں مہارت پیدا کر کے لسانِ قوم میں اسلامی لٹریچر فراہم کریں۔

خلاصہ

اوپر جو باتیں عرض کی گئیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان حریف اور رقیب کا رشتہ ختم کیا جائے اور ان کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کیا جائے۔ جس دن ایسا ہو گا کہ مسلمان اپنے آپ کو داعی اور دوسری قوموں کو مدعو سمجھنے لگیں، اسی دن مسلمانوں کے اندر وہ تمام اعلیٰ صفات پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی جو موجودہ زمانہ میں اسلام کے احیاء کی جدوجہد کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ داعی اور مدعو کا رشتہ پرجوش تقریری الفاظ بول دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ موجودہ دنیا میں سب سے بڑی قربانی ہے۔ اس کے لیے ہمیں دوسری قوموں سے اپنی تمام شکایتوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دینا ہو گا۔ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ دوسری قوموں سے محبت کی جائے خواہ وہ ہماری دشمن بنی ہوئی ہوں۔ دوسری قوموں کے لیے نیک دعائیں کی جائیں، خواہ وہ ہمارے خلاف سازش کر رہی ہوں۔ دوسری قوموں کو خیر خواہی کا موضوع بنایا جائے خواہ ہمارے نزدیک وہ ہماری بدخواہی میں مشغول ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ وہ حق کے داعی بنیں اور حق کے داعی صرف وہ لوگ بنتے ہیں جو اپنے مدعو کو اپنے لیے محبت اور خیر خواہی کا موضوع بنا چکے ہوں۔

ایک سفر

۲۳ فروری سے ۲ مارچ ۱۹۸۷ تک میں ایک سفر میں تھا۔ دہلی سے الہٰ آباد، الہٰ آباد سے بمبئی، بمبئی سے اعظم گڈھ، اعظم گڈھ سے الہٰ آباد ہوتے ہوئے واپس دہلی۔ یہ سفر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان تمام سفروں سے مختلف تھا جن کی روداد یں اب تک الرسالہ کے صفحات میں آتی رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جو غالباً میں نے اپنی باشعور زندگی میں پہلی بار کیا ہے۔ یعنی شادی اور بارات کا سفر۔ اس شادی کی بارات ۲۴ فروری کی شام کو بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی گئی اور ۲۶ فروری کی شام کو دوبارہ بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی سے واپس آئی۔

میرے ایک بے حد قریبی عزیز ہیں جو ہمارے خاندانی بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے حکم کو میں ٹال نہیں سکتا۔ ان کے آخری صاحبزادہ کا نکاح تھا۔ ان کا حکم ہوا کہ میں لازمی طور پر اس تقریب کے لیے سفر کروں اور اس میں شروع سے آخر تک شریک رہوں۔ بچپن کی زندگی کے بعد میں اپنی ساری عمر میں شادی کی تقریبات سے دور رہا ہوں۔ مگر مذکورہ عزیز کا حکم ٹالنا میرے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے "بارات" کے ساتھ شریک سفر ہو گیا۔

اس سفر کا آغاز ۲۳ فروری ۱۹۸۷ کی شام کو ہوا جب کہ میں ٹرین کے ذریعہ دہلی سے الہٰ آباد کے لیے روانہ ہوا۔ ٹرین کیا ہے۔ ٹرین ایک قسم کا دوڑتا ہوا گھر ہے۔ ایک ہزار سال پہلے اگر کوئی شخص کہتا کہ میں نے دوڑتا ہوا گھر دیکھا ہے تو سننے والے سمجھتے کہ شاید یہ جادو کے دیس کی باتیں ہیں۔ مگر آج ایسے گھر بطور واقعہ وجود میں آچکے ہیں۔ ٹرین کے اندر وہ تمام ضروری سامان ہوتا ہے۔ جو ایک گھر کے اندر ہوتا ہے۔ آپ صرف یہ کرتے ہیں کہ ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہوتا ہے اور دوڑتا ہوا آپ کو آپ کی منزل پر پہونچا دیتا ہے۔ کیسی عجیب ہے خدا کی وہ نعمت جس کو جدید سواری کہا جاتا ہے۔

دہلی سے الہٰ آباد کا سفر پریاگ راج اکسپریس سے ہوا۔ رات کو دس بجے ہم گاڑی میں داخل ہو کر سو گیے۔ صبح اٹھے تو گاڑی الہٰ آباد پہونچ رہی تھی۔ یہ انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے سفر کو اس کے لیے اتنا آسان بنا دیا۔ ایک وقت تھا کہ آدمی اپنے پاؤں سے جتنا چلتا تھا اتنا

ہی اس کا سفر طے ہوتا تھا۔ اس کے بعد جانوروں کے ذریعہ سواری کا زمانہ آیا۔ اب آدمی دن کو سفر کرتا اور رات کو پڑاؤ ڈالتا۔ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی سواریاں دیدی ہیں کہ رات اور دن کے فرق کے بغیر وہ مسلسل اپنا سفر طے کر سکتا ہے۔ تاہم حقیقی مسافر وہ ہے جس کے لیے اس کا مادی سفر معرفت کا سفر بن جائے۔

موجودہ زمانہ پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ خدائی نعمتوں کے ظہور کا زمانہ ہے۔ اس اعتبار سے آج کے انسان کو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ مگر آج کا زمانہ شاید تاریخ کا وہ زمانہ ہے جب کہ سب سے کم ایسے انسان ہیں جو واقعی معنوں میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوں۔ موجودہ زمانہ میں جو انسانی بگاڑ ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یقینی طور پر یہی ہے۔ شکر آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے اور اگر آدمی کے اندر سے شکر کا جذبہ نکل جائے تو اس کے بعد جو چیز بچتی ہے وہ سرکشی ہے اور سرکشی بلاشبہ تمام برائیوں میں سب سے بڑی برائی ہے۔

الٰہ آباد کے لیے میرا پہلا سفر غالباً ۱۹۵۰ میں ہوا تھا۔ اس سفر کا مقصد ایک پمفلٹ (اطاعت خدا کی یا انسان کی) چھپوانا تھا۔ یہ پمفلٹ ونڈائک طریقہ پر اسرار کریمی پریس سے چھپوایا گیا تھا۔

یہاں کی ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات وہ تھی جو جناب انوار علی خاں سوز ایم اے سے ہوئی۔ وہ اس وقت جماعتِ اسلامی کے اخبار الانصاف کے اڈیٹر تھے جو بعد کو "دعوت" کے نام سے دہلی سے نکلنا شروع ہوا۔ جناب انوار علی خاں سوز ہائی اسکول پاس کر کے انٹر کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ جماعتِ اسلامی کے انقلابی فکر سے متاثر ہو گیے۔ اس فکر کے مطابق انسان کی حاکمیت پر مبنی ہر نظام طاغوتی نظام ہے اور اس سے علٰحدگی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کفر و شرک سے علٰحدگی۔ تعلیمی اداروں جیسے بظاہر معصوم ادارے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ بہت سے دوسرے نوجوانوں کی طرح انوار علی خاں سوز صاحب نے بھی تعلیم چھوڑ دی اور اخبار الانصاف میں کام کرنے لگے۔ جہاں تک یاد ہے ایک چھوٹے سے کمرے کے اندر، کاغذات کے ڈھیر کے درمیان وہ اکیلے کام کیا کرتے تھے۔

اس ناقابل عمل نظریہ کے خالق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنا مسئلہ تو اس طرح حل کیا کہ ۱۹۴۹ میں جب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد منظور کی تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ پاکستان کی ریاست نے کلمہ پڑھ لیا

ہے۔ اس لیے اب یہاں کے نظام میں شرکت افراد جماعت کے لیے جائز ہو گئی ہے۔

ہندستان کی جماعت اسلامی کے افراد بدستور مشکل میں پھنسے ہوئے تھے۔ آخر کار انھوں نے عملی ضرورت کی منطق کے تحت اس مشکل کا حل تلاش کر لیا۔ وہ عقیدۃً جس چیز کو ناجائز سمجھ رہے تھے، اس کو انھوں نے حالات کے دباؤ کے تحت بلا اعلان اپنے لیے جائز کر لیا۔ انھوں نے دوبارہ ان اداروں میں جانا شروع کر دیا جن کو انھوں نے طاغوتی ادارہ قرار دے کر چھوڑ دیا تھا۔ جناب انوار علی خاں سوز بھی انھیں نوجوانوں میں سے ایک تھے۔ چنانچہ بعد کو الانصاف سے الگ ہو کر انھوں نے بی اے کیا۔ اور پھر انگلش لٹریچر سے ایم اے کیا۔ اب وہ جامعہ ملیہ (دہلی) میں انگلش لٹریچر کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

الٰہ آباد کے لیے میرا دوسرا سفر ۱۹۶۰ میں ہوا۔ ۲۲ مئی ۱۹۶۰ کو الٰہ آباد میں آریہ سماج کی طرف سے ایک سرو دھرم سمیلن (کل مذاہب کانفرنس) ہوئی۔ اس موقع پر مجھے ایک مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس پروگرام کے تحت الٰہ آباد کا سفر ہوا۔ میرا مقالہ پیشگی طور پر چھپوا لیا گیا تھا جو وہاں عمومی طور پر تقسیم ہوا۔ یہ مقالہ "منزل کی طرف" کے نام سے اسلام اور عصر حاضر نامی کتاب میں شامل ہے۔

اس سفر کی یادوں میں سے ایک یاد یہ ہے کہ میں نے اس سفر میں پہلی بار گنگا اور جمنا کا سنگم دیکھا۔ ہندو عقیدہ کے مطابق گنگا دنیا کا سب سے زیادہ مقدس دریا ہے۔ الٰہ آباد کے پاس گنگا اور جمنا دونوں کا پانی ملتا ہے۔ یہاں ملاپ کے مقام پر واضح طور پر ایک لکیر سی نظر آتی ہے جو دور تک چلی گئی ہے۔ یہ منظر گویا قرآن کی اس آیت کا مشاہدہ کراتا ہے: مرج البحرین یلتقیان بینهما برزخ لا یبغیان۔

الٰہ آباد کے لیے میرا تیسرا سفر ۱۹۸۱ میں اور چوتھا سفر ۱۹۸۳ میں ہوا۔ ان دونوں سفروں کا مقصد اپنے بھائی اور اپنی والدہ سے ملاقات کرنا تھا۔ الٰہ آباد کے لیے میرا پانچواں سفر فروری ۱۹۸۷ میں ہوا۔ اس آخری سفر کی روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

الٰہ آباد ہندستان کا ایک قدیم شہر ہے جو گنگا اور جمنا کے سنگم پر آباد ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی ہندستان کی قدیم یونیورسٹیوں میں سے ہے جو سو سال پہلے ۱۸۸۷ میں قائم ہوئی تھی۔ یہاں ایک

پرانا قلعہ ہے جس کو شہنشاہ اکبر نے ۱۵۸۳ میں بنوایا تھا۔ قدیم زمانہ میں یہاں "پریاگ" نام سے ایک شہر آباد تھا۔ ۱۵۸۳ میں مغلوں نے اس کو موجودہ نام کے ساتھ ازسرِ نو آباد کیا۔ ۱۸۰۱ میں وہ برطانیہ کے قبضہ میں آیا۔

الٰہ آباد کے لفظ سے سب سے پہلے میں قبل از آزادی کے دور میں اس وقت واقف ہوا جب کہ میں نے ایک آزادی پسند ہندستانی کا مضمون پڑھا۔ انھوں نے انگریز اور انگریزی تہذیب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ الٰہ آباد ان کی زبان میں آل بیڈ (Allahabad) بن جاتا ہے اور لالہ ان کے یہاں پاپی (Poppy) کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

"الٰہ آباد" کے لفظ سے دوسری بار میں ایک شاعر کے شعر کے ذریعہ آشنا ہوا۔ وہ اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے۔ ان کا تخلص نادان تھا۔ ان کے دو اشعار یہ ہیں:

فلک تیرا بگڑتا کیا اگر ناداں بھی سر ہوتا   مزے کی زندگی کٹتی الٰہ آباد گھر ہوتا

ملا میں چیف جسٹس سے ملا سر تیج بہرو سے   اگر ناداں نہ ہوتا میں تو کل میراڈ نر ہوتا

یہ دونوں واقعات موجودہ صدی کے ربع ثانی سے متعلق ہیں جس میں میرا بچپن اور نوجوانی کا زمانہ گزرا ہے۔ یہ واقعات علامتی طور پر بتاتے ہیں کہ پچاس سال پہلے کا وہ ماحول کیا تھا جس میں میرے جیسے کروروں لوگوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام گزارے ہیں۔ یہ ایسا دور تھا جس میں بڑوں کے پاس اپنے چھوٹوں کو دینے کے لیے صرف ایسے الفاظ تھے جن کا کوئی مطلب نہ حال میں تھا اور نہ مستقبل میں۔ چنانچہ جب میں بڑا ہوا تو زندگی کی ہر حقیقت مجھے خود اپنی تلاش سے دریافت کرنی پڑی، کیوں کہ میرا ماحول مجھے زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ کرنے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔

الٰہ آباد میں مسٹر نصر حشمت سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے گھر میں ایک ہرن پالے ہوئے تھے۔ ۱۴ سال کی عمر کو پہونچ کر وہ مر گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہرن کی یہ موت قبل از وقت تھی۔ وہ اس کے کھانے پینے کا نہایت اعلیٰ اہتمام کرتے تھے۔ مگر ہرن جب کھلے جنگل میں چوکڑی بھرتا ہے تو اس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ جب کہ قید (Captivity) میں اس کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے جو ہرن کے لیے بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنا کہ انسان کے لیے۔ اس دنیا میں عمل کا نام زندگی ہے اور بے عملی کا نام موت۔

الٰہ آباد سے بمبئی جانے کے لیے بابت پور (بنارس) کے ہوائی اڈہ سے جہاز پکڑنا تھا۔ الٰہ آباد سے بارات کاروں کے ایک قافلہ کی صورت میں روانہ ہوئی۔ راستہ میں کئی بار ایسا ہوا کہ سامنے کوئی لاری یا ٹرک آگیا۔ ہماری گاڑی نے "پاس" کے لیے باربار ہارن دیا مگر اس نے پاس نہیں دیا۔ ان سڑکوں پر آج کل یہ عام حالت ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ چند سال پہلے یہی معاملہ ایک ایس پی (پولیس افسر) کے ساتھ پیش آیا۔ وہ جیپ پر سفر کر رہا تھا، سامنے ایک لاری والا آگیا۔ بار بار ہارن کے باوجود اس نے پاس نہیں دیا۔ جیپ مجبوراً اس کے پیچھے چلتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک بازار آیا جہاں لاری کو سواری اتارنے کے لیے رکنا تھا۔ جیسے ہی لاری کھڑی ہوئی، ایس پی نے اپنی جیپ لاکر اس کے آگے کھڑی کر دی۔ اور نہایت تیزی کے ساتھ ڈرائیور کو کھینچ کر باہر نکالا اور اس کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس کو بری طرح نڈھال کر دیا۔ بتانے والے نے بتایا کہ اس کے بعد ایک سال تک اس سڑک پر لاری اور ٹرک والے صرف ایک ہارن پر فوراً پاس دے دیا کرتے تھے۔

موجودہ بڑھی ہوئی بدعنوانی کی واحد وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے ڈر نکل گیا ہے۔ اگر لوگوں کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ جو کچھ کریں گے اس کی سزا انھیں بھگتنی پڑے گی تو وہ کبھی بدعنوانی نہ کریں۔

"پاکستان" کا لفظ اگرچہ بعد کو وضع ہوا، مگر علٰحدہ مسلم اسٹیٹ کے تصور کے طور پر سب سے پہلے یہ نظریہ ڈاکٹر محمد اقبال نے الٰہ آباد میں پیش کیا تھا۔ ۱۹۳۰ میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

I would like to see the Punjab, North-west Frontier Province, Sind and Baluchistan amalgamated into a single state. Self-government within the British Empire, or without the British Empire, the formation of a consolidated North-west Indian Muslim State appears to me to be the final destiny of the Muslims, at least of North West India.

Speeches, Writings, Statements of Iqbal, edited by Latif Ahmed Sherwani (Iqbal Academy, Lahore, Pakistan 1977).

میں یہ دیکھنا پسند کروں گا کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک

واحد ریاست بنا دی جائے ۔ ایک خود اختیاری حکومت ، خواہ برطانی شہنشاہیت کے تحت یا برطانی شہنشاہیت کے بغیر۔ شمال مغربی حصہ کو ملاکر ہندستانی مسلمانوں کی ایک اسٹیٹ کا قیام مجھے مسلمانوں کی آخری تقدیر نظر آتی ہے ، کم ازکم شمال مغربی ہندستان کے لیے ۔

اقبال کو نظر آرہا تھا کہ غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کا وجود خطرہ میں ہے ۔ اس لیے انھیں علٰحدہ ریاست قائم کرنا چاہیے ۔ مگر بعد کے واقعات نے اس کی تصدیق نہیں کی ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ترقی کے وہ سارے امکانات پوری طرح موجود تھے جس کے لیے غیر ضروری طور پر انھوں نے پاکستان بنوایا ۔

۲۴ فروری کو جب تقریباً ۴۰ آدمیوں کی بارات کے ساتھ الٰہ آباد سے بمبئی کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز روانگی ہوئی تو میں نے سوچا کہ ۵۴ سال پہلے ڈاکٹر اقبال ٹرین پر سوار ہو کر الٰہ آباد آئے تھے تاکہ مسلمانوں کو یہ خبر دیں کہ غیر منقسم ہندستان میں تمہارا وجود خطرہ میں ہے ۔ اب ۵۴ سال بعد اسی الٰہ آباد سے مسلمانوں کا قافلہ ہوائی جہاز سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو رہا ہے ۔ اقبال اگر زندگی کے امکانات کو جانتے تو وہ مسلمانوں کو " علٰحدگی " کے بجائے " اتحاد " کا مشورہ دیتے ۔

اقبال اور ان کے ساتھی صرف حال کے اندیشوں میں گم تھے ۔ وہ مستقبل کے امکانات کو نہ جان سکے ۔ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کا یہی فکری افلاس ہے جس کی بنا پر وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو صحیح رہنمائی دینے میں ناکام رہے ۔

۲۴ فروری کی رات کو ہم لوگ بمبئی پہونچے ۔ بمبئی کے بعض ساتھیوں (ڈاکٹر عبدالکریم نائک ، نسیم علی خاں صاحب) کو میرے سفر کی خبر مل گئی تھی ، اس لیے وہ لوگ بھی ایرپورٹ پر آگیے ۔ ان سے مشورہ کے بعد بمبئی کے لیے چند پروگرام طے کیے گیے تاکہ اس قیام کا دعوتی فائدہ بھی حاصل ہو جائے ۔ بمبئی میں میرا قیام ہوٹل میٹرو انٹرنیشنل میں تھا ۔

۲۵ فروری ۱۹۸۷ کی صبح کو پونا اور بمبئی کے کئی ساتھی ہوٹل میں آگیے ۔ ان سے دیر تک گفتگو اور مشورہ جاری رہا ۔

دوپہر کو آل انڈیا ریڈیو کے بمبئی یونٹ میں ایک تقریر ریکارڈ کی گئی جو ۱۲ اپریل کو نشر کی گئی ۔ اس تقریر کا عنوان تھا : فرقہ واریت کا مسئلہ ۔ ریڈیو اسٹیشن کے پروڈکشن اسسٹنٹ مسٹر

سرِیش میرچندانی نے اس کو ریکارڈ کرایا۔ جب میں فارغ ہو کر اسٹوڈیو سے باہر آیا تو مسٹر چندانی نے کہا کہ آپ کی ٹاک مجھ کو بہت پسند آئی۔ میں نے کہا کہ اس کی کیا بات آپ کو پسند آئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے اپنی ٹاک میں نمرتا کی بات کہی، اور میں سمجھتا ہوں کہ نمرتا آدمی کی سب سے بڑی صفت ہے۔

ظہر کی نماز کے بعد روزنامہ انقلابؔ کے نمائندوں نے انٹرویو لیا۔ ان کے زیادہ تر سوالات ملی مسائل کے بارہ میں تھے۔ میں نے کہا کہ اس سلسلہ میں اصل سوال ذہنی نظریہ (Attitude of mind) کا ہے۔ مسلمان اب تک تعصب کی اصطلاحوں میں سوچتے رہے ہیں۔ اگر وہ یہ سوچنے لگیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ مقابلہ (Competition) کے نتائج ہیں تو ان کی سوچ بدل جائے گی۔ تعصب کا ذہن آدمی کے اندر مایوسی پیدا کرتا ہے، جب کہ مقابلہ کا ذہن امید کی راہ کھولتا ہے۔

آخر میں ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ مسلمان بھیڑ اور اتحاد میں فرق نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ اکثر غلط فہمی میں پڑ کر ایک چیز کو اتحاد سمجھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت وہ بھیڑ ہوتی ہے۔ اگر آپ دوسروں کے خلاف چیخ و پکار کے لیے جمع ہوں تو یہ بھیڑ ہے، اور اگر آپ اپنی اصلاح و تعمیر کے لیے اکٹھا ہوں تو یہ اتحاد ہے۔ میں نے کہا کہ ایک لفظ میں یہ سمجھ لیجئے کہ: تخریب کے لیے جمع ہونا بھیڑ ہے، تعمیر کے لیے جمع ہونا اتحاد ہے۔ یہ انٹرویو اخبار انقلاب (۱۳، ۱۸ مارچ ۱۹۸۷) میں شائع ہو چکا ہے۔

شام کو ۵ بجے انڈو عرب سوسائٹی (ویر نارائن روڈ) پر ایک تقریر تھی۔ اس تقریر کا عنوان سوسائٹی والوں نے یہ مقرر کیا تھا:

Islam and human brotherhood

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہیومن برادرہڈ دراصل کچھ ہیومن ویلوز (Human values) سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہیومن ویلوز تاریخ میں سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا۔ مثلاً انسان کی آزادی اور مساوات کے اعلان کے سلسلہ میں اکثر روسو (۱۷۷۸ - ۱۷۱۲) کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس کی کتاب (سوشل کنٹریکٹ) کا پہلا جملہ یہ ہے: انسان آزاد پیدا ہوا تھا مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا

دیکھتا ہوں۔ لیکن یہ جملہ درحقیقت اس قول کی نقل ہے جو روسو سے بارہ سو سال پہلے حضرت عمر کی زبان سے اس وقت نکلا تھا جب کہ انھوں نے اس نظریہ کو واقعہ بنایا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں مصر کے گورنر عمرو بن العاصؓ کے لڑکے نے مصر کے ایک قبطی کو مارا اور اس کی تحقیر کی۔ حضرت عمرؓ نے گورنر اور ان کے بیٹے کو مدینہ بلایا اور قبطی کے ہاتھ میں کوڑا دے کر کہا کہ جس نے تمہیں مارا ہے تم بھی اس کو مارو۔ چنانچہ اس نے مارا۔ آخر میں حضرت عمر نے گورنر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے عمرو، تم نے کب سے انسانوں کو غلام بنا لیا حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا (یا عمرو، متی تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا)

۲۶ فروری کو ۱۰ بجے ملاقات کی ایک نشست ہوئی۔ یہ نشست محبوب اسٹوڈیو کے اندر ہوئی۔ اس نشست میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک تھے۔ زیادہ تر گفتگو سوال و جواب کے انداز میں ہوئی۔ میں نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کہی کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل المیہ یہ ہے کہ ان کے اندر خارجی طرزِ فکر پیدا ہو گیا ہے۔ ہر آدمی کسی دوسرے کو ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف لکھنے اور بولنے میں لگا ہوا ہے۔ یہ طرزِ فکر غیر عقلی بھی ہے اور غیر اسلامی بھی۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر داخلی طرزِ فکر پیدا کیا جائے۔ خارجی طرزِ فکر صرف شکایت اور احتجاج کا ذہن پیدا کرتا ہے جب کہ داخلی طرزِ فکر سے عمل کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ایک بزنس منیجر کے اندر سب سے زیادہ جو چیز دیکھی جاتی ہے وہ یہ کہ اس کے اندر فیصلہ لینے (Decision making) کی صلاحیت ہو۔ یہ بلاشبہ بہت اہم بات ہے اور نہ صرف بزنس میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی اہمیت ہے۔

اس سلسلہ میں یہاں ایک واقعہ معلوم ہوا جو اس اصول کی بہت اچھی وضاحت کرتا ہے۔ کتابوں کی تجارت کی دنیا میں آج کل ایک طریقہ بہت رائج ہے۔ وہ یہ کہ کسی مقبول کتاب کو لے کر اس کی نقل کو چھپوا لینا اور اس کو بازار میں فروخت کرنا۔ اس کو عام طور پر قزاقی اڈیشن (Pirate edition) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ کتاب میں اپنا نام اور پتہ نہیں دیتے، اس لیے ان کو پکڑنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ یہ طریقہ عام طور پر زیادہ چلنے والی ناولوں کے سلسلہ میں اختیار کیا جاتا ہے۔

چند سال ہوئے امریکہ کے مشہور اشاعتی ادارہ پنگوئن کا چیرمین جاپان جاتے ہوئے بمبئی سے

گزرا۔ وہ بمبئی کے تاج ہوٹل میں ٹرانزٹ مسافر کے طور پر ایک دن کے لیے رکا تھا۔ وہ یہاں کتابوں کے بازار میں گیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا چھاپا ہوا ایک ناول بمبئی کے بازار میں فروخت ہو رہا ہے۔ یہ کتاب ابھی بالکل حال میں چھپی تھی اور ابھی تک وہ امریکہ سے یورپ کے بازار میں بھی نہیں پہونچی تھی۔ مگر وہ بمبئی کے بازار میں بک رہی تھی۔ یہ دراصل کتاب کا قزاقی اڈیشن تھا۔ کسی نے امریکہ میں اس کی طباعت کے فوراً بعد اس کا ایک نسخہ حاصل کیا اور اس کا فوٹو لے کر چند دن کے اندر اس کو چھاپا اور اس کو بمبئی کے مارکیٹ میں پہونچا دیا۔

یہ دیکھ کر پنگوئن کے چیرمین نے فوراً بمبئی میں اپنی اقامت بڑھائی۔ اس نے یہاں کے پبلشرز سے بات چیت کی۔ اس کے بعد ایک پبلشر سے معاہدہ کر لیا۔ اس نے یہ انتظام کیا کہ جو کتاب وہ امریکہ میں چھاپے اس کی کاپی فوراً وہ بمبئی کے پبلشر کو بھیج دے۔ وہ اس کو فوراً چھاپ کر بمبئی کے بازار میں پہونچا دے۔ یہ طریقہ نہایت کامیاب رہا۔ امریکہ کے دوسرے پبلشروں نے بھی بعد کو اسی کو اختیار کیا۔ یہاں تک کہ قزاقی اڈیشن چھاپنے والوں کی جڑ کٹ گئی۔

بمبئی سے مجھ کو بنارس آنا تھا اور وہاں سے پھر اعظم گڈھ کا سفر کرنا تھا۔ بمبئی سے بنارس کا سفر ۲۶ فروری کو فلائٹ نمبر ۱۹۵ کے ذریعہ ہوا۔ درمیان میں موسم بہت خراب ہو گیا، اعلان ہوا کہ تمام مسافر کرسی کی پیٹی باندھ لیں۔ اچانک مسافروں میں سنسنی پھیل گئی۔ کیوں کہ جہاز اس طرح نیچے اوپر ہونے لگا تھا جیسے ایک ایسی سڑک پر گاڑی دوڑ رہی ہو جس پر جگہ جگہ گہرے گڑھے کھود دیے گئے ہوں۔ سڑک پر کوئی دوڑتی ہوئی کار اگر اتنا زیادہ نیچے اوپر ہو جتنا جہاز ایسے موقع پر نیچے اوپر ہوتا ہے تو کار الٹ جائے گی اور سفر کا جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ مگر ہوائی سفر میں بڑے بڑے "فضائی گڑھوں" کے باوجود سفر جاری رہتا ہے۔ یہ بھی ایک خدائی مصلحت ہے۔ وہ انسان کو موت کے گڑھے میں ڈالتا ہے اور پھر اس سے نکال کر اسے موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر ادا کرے اور آئندہ کے لیے زیادہ عنایات کا مستحق ثابت ہو۔

۲۶ فروری کی رات کو ہم اعظم گڈھ پہونچے۔ یہاں ۲ مارچ کی صبح تک ۹ بدرقہ، اعظم گڈھ میں میرا قیام رہا۔ اعظم گڈھ اتر پردیش کا ایک شہر ہے۔ اس کو ۱۶۶۵ میں راجہ اعظم خاں نے بسایا تھا۔ انھیں کے نام پر وہ اعظم گڈھ کہا جانے لگا۔ ۱۹۷۱ کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۴۰ ہزار تھی۔

اب اس کی آبادی تقریباً دگنا ہو چکی ہے ۔

۲۷ فروری کو نماز جمعہ جامعۃ الرشاد کی مسجد میں ادا کی ۔ نماز جمعہ سے پہلے ایک مختصر تقریر کی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ایمان واسلام کی حقیقت کیا ہے ۔ ۲۸ فروری کو دوبارہ جامعۃ الرشاد میں ایک پروگرام تھا۔ یہ پروگرام عصر کی نماز کے بعد تھا۔ اس موقع پر میں نے اساتذہ اور طلبہ کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں زندگی کی تعمیر سے متعلق کچھ باتیں عرض کی گئیں ۔

۲۷ فروری کو نماز ظہر کے بعد بلریا گنج (اعظم گڈھ) میں ایک پروگرام تھا۔ یہاں جامعۃ الفلاح کے طلبہ اور اساتذہ کے اجتماع میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا موضوع تھا: اسلامی دعوت کے جدید امکانات ۔ اس تقریر میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس موضوع کی وضاحت کی گئی ۔ ایک طالب علم نے آٹوگراف کی فرمائش کی۔ میں نے ان کی کاپی پر یہ فقرہ لکھ دیا :

تمام علوم محنت کی درس گاہ میں پڑھائے جاتے ہیں

اسی طرح مختلف طالب علموں کی نوٹ بک پر مختلف فقرے تحریر کیے ۔ ایک طالب علم کی نوٹ بک پر حسب ذیل فقرہ لکھا :

سب سے مشکل کام اپنے آپ کو جاننا ہے اور سب سے آسان کام دوسروں کو جاننا

اعظم گڈھ کے دو روزہ (۲۷۔ ۲۸ فروری) قیام میں بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ہمارا آبائی وطن اگرچہ قریب کے ایک گاؤں میں تھا۔ مگر بعد کو ہمارے خاندان کے لوگ شہر منتقل ہوگئے۔ سب سے پہلے میرے چچازاد بھائی اقبال احمد سہیل اعظم گڈھ شہر میں آئے۔ وہ یہاں کے کامیاب ترین وکیل تھے ۔ ۱۹۴۰ کے لگ بھگ زمانہ میں انھوں نے فورڈ موٹر کار منگوائی تو یہ شہر میں دوسری موٹر کار تھی ۔ پہلی کار راجہ ہرکھ چند کی تھی اور دوسری کار ہمارے بھائی صاحب کی۔ یہ فورڈ کا ماڈل ۱۹۲۷ تھا۔ ۱۹۴۴ میں میرے بھائی عبد العزیز خاں صاحب نے اعظم گڈھ میں کاروبار شروع کیا۔ مگر اعظم گڈھ ابھی تک "چھوٹی لائن" پر رہے۔ اس لیے یہاں تجارتی ترقی کے مواقع نسبتاً کم ہیں۔ چنانچہ ۱۹۷۹ میں وہ الٰہ آباد منتقل ہوگئے ۔

۱۹۴۰ میں غالباً پہلی بار میں اعظم گڈھ آیا۔ اس وقت کے بعض واقعات اب تک مجھے یاد ہیں۔ میں نے دیکھا کہ شہر کے چوراہہ پر کچھ لوگ چائے فروخت کر رہے ہیں ۔ وہ ایک پیسہ میں پانچ پیالی

پلاتے اور اسی کے ساتھ چائے کی پتی کا ایک چھوٹا سا پیکٹ مفت دیتے تھے۔ اسی طرح میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ دیا سلائی فروخت کر رہے ہیں اور یہ آواز لگا رہے ہیں :

دیا سلیا پیسہ میں سوئیا چار منافع میں

کچھ لوگ سگریٹ تقسیم کرتے تھے۔ وہ سگریٹ کا ذخیرہ اپنے ساتھ لیے رہتے اور جہاں کوئی مجمع دیکھتے، بہت سارا سگریٹ ان کے درمیان پھینک دیتے۔ لوگ ان سگریٹوں کو " لوٹتے " اور ان کو تماشہ کے طور پر پیتے۔

یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جو اس ملک میں نصف صدی پہلے پایا جاتا تھا۔ اس وقت لوگ نئی چیزوں سے آشنا نہ تھے۔ وہ انھیں خریدنا پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ تاجر طبقہ انھیں نہایت معمولی قیمت پر لوگوں کو دیتا، بلکہ اکثر اوقات مفت دیتا۔ آج جب لوگ عادی ہوگیے ہیں تو آج حالات بالکل مختلف ہیں۔

مدرسہ سے نکلنے کے بعد میں نے مختلف علوم کا جو مطالعہ کیا، اس کا ایک زمانہ اعظم گڈھ میں گزرا ہے۔ یہاں میں انگریزی کتب کے لیے مہتا لائبریری جایا کرتا تھا، اور عربی کتب کے لیے کتب خانہ دار المصنفین۔ یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ مجھے یاد ہے کہ مہتا لائبریری میں میں جو کتابیں پڑھنے کے لیے نکالتا تھا ان پر اکثر گرد جمی ہوتی تھی۔ کیوں کہ سالہا سال سے کسی نے ان علمی کتابوں کو چھوا نہیں تھا۔ یہاں زیادہ تر لوگ اخبار پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ علمی مطالعہ کے لیے آنے والا شاید اکیلا میں ہی تھا۔

دار المصنفین میں مطالعہ کا ایک تذکرہ میری کتاب (تعبیر کی غلطی) میں درج ہے۔ یہ واقعہ مذکورہ کتاب کے دیباچہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یکم مارچ کو دار المصنفین دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ علمی ادارہ ۱۹۱۵ میں مولانا شبلی نعمانی نے قائم کیا تھا۔ اعظم گڈھ میں قیام کے زمانہ میں میں نے اس کے کتب خانہ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اس زمانہ میں انگریزی کی معلومات میں نے مہتا لائبریری سے حاصل کی تھیں، اور عربی کی معلومات دار المصنفین کے کتب خانہ سے۔

دس سال کے بعد یہاں کئی نئی چیزیں نظر آئیں۔ انھیں میں سے ایک چیز میوزیم ہے۔ اس

کے اندر بہت سی نادر چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ فارسی کی ایک کتاب (مخطوطہ) ہے جس کا نام مونس الارواح ہے۔ یہ جہاں آرا بیگم کی تصنیف ہے اور ۱۰۶۸ھ میں سونے کی رنگ کاری کے ساتھ نہایت اہتمام کے ساتھ لکھی گئی تھی۔ یہاں سب سے نادر کتاب یہی ہے۔ وہ خود جہاں آرا بیگم کے استعمال میں رہ چکی ہے۔ لندن کی نمائش ۱۹۱۱ میں یہ کتاب ۱۵ ہزار روپیہ میں انشورڈ کر کے بھیجی گئی تھی۔

اس میوزیم میں مولانا شبلی نعمانی کا مصنوعی پاؤں بھی رکھا ہوا ہے۔ بندوق چل جانے سے مولانا شبلی کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا جو بعد کو کاٹ دیا گیا۔ اس وقت نواب بھاول پور نے خاص اہتمام سے لکڑی کا پاؤں تیار کرا کے بھیجا جس کو وہ آخر تک استعمال کرتے رہے۔ پاؤں کٹنے کے واقعہ پر شعراء نے حسن تعلیل کے انداز میں بہت سے اشعار کہے تھے۔ ان میں سے ایک قطعہ یہ تھا:

شکستہ پائی مقدر تھی سرنوشت میں تھی　　نہ ہاتھ آئے گا اب کچھ بھی ہاتھ ملنے سے
عدم کی دور ہے منزل نہ جا سکیں گے حضور　　چلے گا قوم کا کام آپ کے نہ چلنے سے

ہماری قوم کے شاعروں نے شکستہ پائی میں حسنِ تعلیل کے نکتے پا لیے۔ مگر ہماری قوم کے قائدین ملّت کی شکست میں فتح کا پہلو دریافت نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی ایک صدی کی مدت چیخ پکار کی سیاست کی نذر ہو گئی، اس مدت میں کوئی دوررس مثبت کام نہ کیا جا سکا۔

دار المصنفین میں سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے دار المصنفین کی تازہ مطبوعہ کتاب اسلام اور مستشرقین (پانچ حصے) تحفہ میں دیئے۔ ۱۹۱۱ میں جنیوا یونیورسٹی کے ایک عیسائی پروفیسر نے مختلف اسلامی موضوعات پر سات لکچر دیئے تھے۔ یہ لکچر فرانسیسی زبان میں تھے۔ ان کا عربی ترجمہ اسی زمانہ میں بیروت سے شائع ہوا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان میں سے ایک لکچر کا خلاصہ ایک عربی رسالہ سے لے کر معارف میں شائع کیا تھا۔ اس خلاصہ کو مذکورہ کتاب کی پانچویں جلد میں نقل کیا گیا ہے۔

اس لکچر میں کہا گیا ہے کہ اسلام ابتدا میں جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر جس تیزی سے دنیا میں پھیلا ہے اور اپنی اشاعت میں اس نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ بہت ہی حیرت انگیز

ہے۔ اس کے اسباب کی تفصیل میں تمام مورخین سخت حیران ہیں ۔

اس سلسلہ میں صاحب لکچر نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمان جس ملک میں گیے وہاں انھوں نے عام ہر دلعزیزی حاصل کی۔ وہ اس ملک یا قوم کے مانوس رسوم و عادات سے سکوت کرتے ہیں، وہ ان کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ غلط مذہبی تخیلات اور مذہبی تہواروں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں ۔ اس طرح اس قوم کے افراد کو اسلام بظاہر کوئی نیا مذہب نہیں معلوم ہوتا ۔ اور وہ اس میں رفتہ رفتہ جذب ہو جاتے ہیں (صفحہ ۶۰) اسی طرح صاحبِ لکچر نے لکھا ہے کہ چین میں یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ پر جوش مسلمانوں نے شانگ ٹونگ کے ہیبت ناک قحط کے زمانہ میں دس ہزار بچوں کو خرید لیا، اور اسلامی تعلیم و تربیت نے ان بچوں کو مسلمان گھرانوں میں بدل دیا ——— موجودہ زمانہ کے مسلمان تہذیبی تفریق میں اپنی زندگی کا راز تلاش کر رہے ہیں، قدیم مسلمانوں نے تہذیبی یگانگت میں اپنی زندگی کا راز دریافت کیا تھا ۔

گاؤں کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس علاقہ کے دیہاتوں کے احوال بتائے ۔ انھوں نے کہا کہ " ہمارے دیہات اب شہر ہو رہے ہیں ۔ لوگ بڑی تعداد میں باہر چلے گیے ہیں اور کافی پیسہ کما رہے ہیں ۔ وہ لوگ جن کا حال پہلے یہ تھا کہ جسم پر پورے کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ پاؤں جوتے سے خالی ہوتے تھے۔ اب انھوں نے کئی منزل کے پختہ مکانات بنا لیے ہیں۔ ان کے دروازے پر کار اور ٹریکٹر کھڑے ہوئے ہیں ۔

اس طرح کی تفصیلات سن کر مجھے ایک حدیث یاد آ گئی ۔ یہ ایک لمبی حدیث ہے ۔ اس میں قیامت کی نشانیاں بتاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی ہے کہ قیامت کی ابتدائی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھو گے کہ بے لباس اور ننگے پاؤں والے لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر اونچی عمارتیں بنائیں گے (وتری العراة الحفاة يتطاولون في البنيان) موجودہ دنیا کے احوال پر جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیامت اب قریب آ چکی ہے۔ بظاہر لوگ اس طرح زندگی گزار رہے ہیں جیسے کہ وہ ان سے بہت دور ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قیامت لوگوں سے بہت قریب ہے ۔ اور بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ وہ ان کے اوپر اس طرح پھٹ پڑے گی کہ وہ نہ اس کو روک سکیں گے اور نہ ان کے لیے یہی ممکن ہوگا کہ اس سے

بھاگ کر کہیں پناہ لے سکیں۔

اس علاقہ کے لوگ بڑی تعداد میں باہر گیے ہیں اور باہر کی کمائی کے نتیجہ میں کافی خوشحال ہو گیے ہیں۔ ایک صاحب نے بنک کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ صرف ضلع اعظم گڈھ میں ہر مہینہ تقریباً ڈیڑھ کرور روپیہ باہر سے آرہا ہے۔ مگر گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ بہت کم لوگ ہیں جو پیسہ کا صحیح استعمال کر رہے ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے بتایا کہ ان کی گفتگو پولس کے ایک آدمی سے ہوئی، اس نے فخریہ انداز میں کہا کہ ہم نے فلاں گاؤں سے ایک سال کے اندر پانچ لاکھ روپئے وصول کیے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس زیادہ پیسے آگیے ہیں وہ جھگڑے فساد میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس طرح پولس کو موقع مل جاتا ہے کہ وہاں پہونچے اور لوگوں سے پیسے وصول کرے۔

یہ ایک مسلم گاؤں کا قصہ ہے۔ عام طور پر ہمارے لیڈر مسلمانوں پر غیر مسلموں کے معاشی ظلم کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اپنی نادانیوں کے نتیجہ میں ہر روز اپنا جو معاشی نقصان کر رہے ہیں وہ دوسروں کے نام نہاد معاشی ظلم سے سیکڑوں گن زیادہ ہے۔

ایک صاحب نے الرسالہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا: الرسالہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے سبق نکالے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کی تعریف ادھوری تعریف ہے۔ الرسالہ کوئی تصنیفی کرشمہ نہیں، وہ ایک تربیتی جدوجہد ہے۔ الرسالہ کا مقصد لوگوں کے اندر یہ ذہن بنانا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے واقعات سے سبق لیتے ہوئے زندگی گزاریں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ غلّہ اور سبزی سے انسان کے جسم کو غذا ملتی ہے۔ اگر غلّہ اور سبزی اور دوسری کھانے کی چیزیں نہ ہوں تو آدمی کے لیے جسمانی فاقہ کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح گرد و پیش کے واقعات سے نصیحت لینا انسان کی روح کی خوراک ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو تو وہ روحانی فاقہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور روحانی فاقہ بلاشبہ جسمانی فاقہ سے بھی زیادہ ہلاکت خیز ہے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے مختلف مسلم اداروں کے احوال بتائے۔ انھوں نے بتایا کہ اکثر مسلم اداروں میں باہمی جھگڑے ہو رہے ہیں۔ عہدوں کی لامتناہی جنگ جاری ہے۔ اس کے نتیجہ میں

ادارے ایک قسم کے ذاتی اکھاڑے بن کر رہ گیے ہیں اور ان کا اصل مقصد اور ان کی ترقی کا کام پس پُشت چلا گیا ہے ۔

اس گفتگو کو سن کر ایک صاحب نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر روزہ اور نماز کے بارہ میں تو جواب دہی کا احساس موجود ہے ۔ مگر دوسرے معاملات میں ان کے اندر سے جواب دہی کا احساس ختم ہو گیا ہے ۔ اگر چند لوگ اکٹھا ہوں اور نماز کا وقت آجائے تو کوئی آدمی امامت کے لیے آگے نہیں بڑھے گا ، ہر آدمی چاہے گا کہ وہ پیچھے رہے اور دوسرا شخص آگے بڑھ کر نماز پڑھائے ۔ مگر یہی لوگ جب نماز سے فارغ ہو کر لوٹتے ہیں تو صدر اور سکریٹری کے عہدے حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز روزہ کے معاملات میں وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہیں ۔ مگر دوسرے معاملات میں ان کا خیال یہ ہے کہ وہ جو چاہیں کریں ، ان کے لیے وہ خدا کے یہاں پکڑے نہیں جائیں گے ۔

میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ جہاں لوگوں کا مفاد نہ ٹکراتا ہو وہاں وہ دیندار ہیں ۔ مگر جہاں انھیں دیندار بننے کے لیے مفاد کی قربانی کی قیمت دینی پڑے وہاں انھیں دیندار بننے سے کوئی دلچسپی نہیں ۔

اعظم گڈھ میں ایک حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ ان کی پریکٹس بہت کامیاب ہے ۔ روزانہ دو سو سے زیادہ مریض ان کے یہاں آتے ہیں ۔ ان سے گفتگو کے بعد مجھے ایک خاص سبق ملا ۔ انھوں نے یہ کیا کہ دوا کی قیمت بہت کم رکھی ۔ بلکہ بہت سے مریضوں کا مفت علاج کرنے لگے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مریضوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ۔ نیز ان کے مریض زیادہ دیر دیر تک ان کے یہاں ٹھہرنے لگے ۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے طبی تجربہ کا میدان بہت وسیع ہو گیا ۔ ان کے الفاظ میں " ان کو راستہ ملنے لگا " ۔ انھوں نے بہت سے مایوس مریضوں کا کامیاب علاج کیا ۔ اس طرح ان کی شہرت بڑھنے لگی ۔ یہاں تک کہ اب ان کے یہاں روزانہ مریضوں کا میلا لگا رہتا ہے ۔

بعض اوقات ایک معمولی تدبیر میں کامیابی کا راز چھپا ہوا ہوتا ہے ۔ مگر اکثر لوگ کامیابی کو کسی بہت غیر معمولی تدبیر کا کرشمہ سمجھتے ہیں ۔ ہندی کا ایک مقولہ بہت بامعنی ہے : سادھارن گنوں سے اَسادھارن منش بنتے ہیں ۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی ، وہ سگریٹ کے عادی تھے ۔ ایک روز وہ باتھ روم میں گیے

تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کے لڑکے نے باتھ روم میں چھپ کر سگریٹ پیا ہے۔ وہ خود سگریٹ کی عادت کی وجہ سے اپنی صحت خراب کر چکے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے لڑکے کی صحت بھی سگریٹ نوشی کی وجہ سے تباہ ہو جائے۔ انھوں نے اپنی بیوی کو بتایا تو وہ بھی بہت پریشان ہو گئیں۔ انھوں نے کہا کہ دیکھو ابھی میں لڑکے سے بات کرتا ہوں، اور ابھی یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ وہ سگریٹ کو چھوڑے گا یا نہیں چھوڑے گا۔ اگر اس نے اپنی غلطی مان لی تو وہ اس کو چھوڑ دے گا، اور اگر اس نے غلطی نہیں مانی تو وہ کبھی نہیں چھوڑے گا۔

انھوں نے لڑکے کو بلایا۔ انھوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ تم نے باتھ روم میں سگریٹ پیا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میری صحت اس سگریٹ نوشی کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہے۔ اب اگر تم سگریٹ پینا چاہتے ہو تو پیو۔ مگر چھپ کر نہ پیو۔ لڑکا جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے اقرار کر لیا کہ ہاں میں نے باتھ روم میں سگریٹ پی ہے، اور اب میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ اس کے بعد لڑکے نے ہمیشہ کے لیے سگریٹ چھوڑ دی۔

آدمی اگر صاف طور پر کہہ دے کہ میں نے غلطی کی تو اس کے بعد اس کے اندر یہ عزم جاگتا ہے کہ وہ آئندہ غلطی نہ کرے۔ اور اگر وہ اپنی غلطی کو نہ مانے تو اپنے غلط ہونے کا احساس اس کے اندر نہیں جاگے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بدستور اپنی غلطی میں مبتلا رہے گا۔

ایک لیڈر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے۔ میں نے کہا کہ الرسالہ بزدلی نہیں سکھاتا۔ یہ دراصل آپ جیسے لیڈر ہیں جو مسلمانوں کو بزدل بنا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے اپنی پُرجوش تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر سے وہ چیز ختم کر دی ہے جس کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک بے صبر قوم بنے ہوئے ہیں۔ ایسی باتیں جن پر اعراض کرنا چاہیے، وہ غیر ضروری طور پر ان سے لڑ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب پولیس آکر مار پیٹ کرتی ہے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ بھاگنا بزبان حال اس کا اعلان ہوتا ہے کہ " ہم بزدل ہیں "۔

انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ ایسے مواقع پر ہمیشہ مسلمان ہی مارے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی اس کا ایک فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کا جو پروٹسٹ ہے وہ رجسٹر رہتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر اس کا مقصد

پروٹسٹ کو رجسٹر کرنا ہے تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ خود لیڈر لوگ آگے بڑھ کر گولیاں کھائیں۔ اگر لیڈر لوگ گولی کھائیں گے اور مارے جائیں گے تو پروٹسٹ زیادہ نمایاں ہوگا اور زیادہ موٹے حرفوں کے ساتھ رجسٹر کیا جائے گا۔ ابھی تک تو وہ صرف باریک حرفوں میں رجسٹر کیا جا رہا ہے۔ اس پر وہ ہنس کر کر خاموش ہو گیے۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ لیڈر جو الفاظ بولنے میں بہادر ہوں اور عمل کرنے میں غیر بہادر۔

یہاں انگریزی اخبار پانیر (The Pioneer) پڑھنے کو ملا۔ وہ یہاں کا علاقائی اخبار ہے جو ۱۲۳ سال سے نکل رہا ہے۔ پہلے وہ صرف لکھنؤ سے چھپتا تھا۔ اب وہ لکھنؤ اور بنارس دونوں مقام سے چھپتا ہے۔ یہ وہی اخبار ہے جس کے متعلق اکبر الٰہ آبادی نے طنزیہ انداز میں کہا تھا :

بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے انگریزی اقتدار کے زمانہ میں مسلمان انگریزی چیزوں کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ غالباً یہی مزاج وہ سب سے بڑا سبب ہے کہ قدیم زمانہ میں مسلمان انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کے بارہ میں حقیقت پسندانہ موقف اختیار نہ کر سکے۔ وہ انگریزی صحافت اور جدید قوتوں کے حصول کے معاملہ میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گیے۔ انگریزی تہذیب کو حقیر سمجھنے کا مزاج مسلمانوں میں اتنا بڑھا کہ مفید چیزوں کا بھی مذاق اڑایا جانے لگا۔ مثلاً اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر ہے :

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا　　پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

یکم مارچ کو جناب علی حماد عباسی (پیدائش ۱۹۳۱) سے ملاقات ہوئی۔ وہ شبلی نیشنل کالج کے پرنسپل ہیں۔ انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا جس میں بہت بڑا سبق ہے۔

انھوں نے بتایا کہ شبلی کالج میں طالب علمی کے زمانہ میں ان کے جو ساتھی تھے، ان میں سے ایک عبدالقیوم صاحب تھے۔ بی اے کرنے کے بعد انھیں ملازمت کی فکر ہوئی اور وہ بمبئی چلے گیے۔ ایک روز وہ بمبئی کے ایک پارک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی وہاں ٹہلتے ہوئے آئے اور ان کے قریب بیٹھ گیے۔ عبدالقیوم صاحب اپنی بے روزگاری کی وجہ سے کافی پریشان تھے۔ نو وارد ان کے چہرہ پر پریشانی کے آثار دیکھ کر ان سے ہم کلام ہوا۔ دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا

خلاصہ یہ تھا :

What are you worried about?
Nothing sir. I want a job, but I can't get it.
Why?
Because I am a Muslim.
What do you mean by it? If you have talent I will give you a job. Come and see me in my office tomorrow.

یہ نووارد مہاراشٹر کا چیف الیکشن کمشنر تھا۔ عبدالقیوم صاحب اگلے دن بتائے ہوئے پتہ پر پہونچے۔ چیف الیکشن کمشنر نے پوچھا کہ تم ٹائپ کرنا جانتے ہو، انھوں نے کہا کہ ہاں، انھوں نے معمولی ٹسٹ لیا اور اسی وقت ان کو اپنے دفتر میں ٹائپسٹ مقرر کر دیا۔ اس وقت الیکشن کمیشن کے دفتر میں ۱۷ عورتیں ٹائپسٹ تھیں۔ عبدالقیوم صاحب ۱۸ ویں شخص تھے جو وہاں ٹائپسٹ مقرر کیے گیے۔ یہ واقعہ ۱۹۵۰ کا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کو مواقع ملے تو انھوں نے مزید تعلیم کی تدبیر شروع کی۔ وہ پڑھتے رہے اور ترقی کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ امریکہ کی پورٹ لینڈ یونیورسٹی میں پہونچ گیے۔ آج کل وہ وہاں کے ایک ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں۔

اعظم گڈھ میں مولانا مجیب اللہ ندوی سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں وہ کئی بار مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملے تھے۔ ایک بار وہ پندرہ دن تک مولانا مرحوم کے ساتھ دہلی میں تھے۔ ان دنوں مولانا مرحوم کے خطوط کا جواب دینا ان کے ذمہ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اس زمانہ میں جو منی آرڈر آتے تھے، مولانا مرحوم اکثر منی آرڈر فارم پر یہ لکھوا کر اسے واپس کر دیتے کہ :

ہم کو مال کی ضرورت نہیں، ہم کو جان کی ضرورت ہے

بظاہر ایک آدمی سوچے گا کہ یہ نادانی ہے۔ جان تو ملی نہیں، اور جو چیز مل رہی تھی اس کو واپس کر دیا۔ مگر یہ نادانی نہیں، یہ سب سے اونچی دانش مندی ہے۔ بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے مال کو واپس کیا تو ان کو مال اور جان دونوں ملے۔ اور جو لوگ مال واپس کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، وہ مال اور جان دونوں سے محروم رہتے ہیں۔

الرسالہ جولائی ۱۹۸۷

مولانا مجیب اللہ ندوی نے خدمت خلق کی اہمیت بتاتے ہوئے اپنا ایک تجربہ (۱۹۶۶) بیان کیا جو ان کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے :

"اعظم گڈھ میں جس کرایہ کے مکان میں میں بال بچوں سمیت رہتا تھا اسی کے سامنے ایک ہریجن لکڑی کی ٹال کرتا تھا اور اس کے گھر کے عورت بچے میرے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ ایک دن چار بجے کے قریب میں دار المصنفین سے واپس آیا تو دیکھا کہ ہریجن کی بیوی رو رہی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے، بولی نرائن (اس کے لڑکے کا نام) کے باپ کو پولیس والے کوتوالی پکڑ لے گئے ہیں۔ میں نے کہا گھبراؤ نہیں میں کوتوالی جاتا ہوں۔ عصر کی جماعت کا وقت قریب تھا، میں نے نماز پڑھی اور پھر آکر واقعہ پوچھا تو بتایا کہ ایک لڑکا کنٹرول کی دوکان سے ایک آدمی کے غلّے کی گٹھری لے کر بھاگا۔ پولیس نے اس کا پیچھا کیا وہ لڑکا گٹھری لکڑی کی ٹال پر پھینک کر چمپت ہوگیا۔ جو پولیس والا لڑکے کی تلاش میں نکلا تھا اس نے لڑکے کو تو پایا نہیں مگر گٹھری ٹال پر مل گئی اس لیے ان کو پکڑ لیا اور کوتوالی لے گیا۔ میں نے شیروانی پہنی اور رکشہ کرکے کوتوالی پہونچا۔ اس سے پہلے کبھی کوتوالی جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں ایک اجنبی کی طرح کوتوالی کے صحن میں ٹہلنے لگا۔ اتفاق سے کوتوال صاحب کمرے سے باہر نکلے اور ایک سفید پوش آدمی کو ٹہلتے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ آپ کیوں ٹہل رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ آدمی جو حوالات کے قریب بیٹھا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ کیا کہنا ہے۔ میں نے صحیح واقعہ بیان کیا۔ ان کو میری بات پر یقین آگیا اور ڈانٹ کر ایک پولیس مین سے کہا کہ اس بے چارے کو کیوں بٹھا رکھا ہے مولوی صاحب کے ساتھ کر دو۔ میں نے اسے رکشہ پر بٹھایا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آگیا۔ اس تھوڑی سی خدمت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بیس برس گزر جانے کے بعد بھی وہ ہریجن اور اس کے بچے مجھ سے ایسا معاملہ کرتے ہیں کہ جیسے میں نے کوئی بہت بڑا احسان کر دیا ہے۔ اس کے لڑکے پاس ہوتے ہیں تو میرا پیر چھونے آتے ہیں۔ ملازمت ملتی ہے تو ممنونیت کے اظہار کے لیے کچھ تحفہ تحائف بھی لاتے ہیں، وہ دوسروں سے کہتے ہیں کہ یہ دیوتا ہیں"

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ اپنا کوئی خاص تجربہ بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ ایک بار میں ایک دیہاتی علاقہ میں سفر کر رہا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ ایک جگہ پہونچا تو وہاں تین آدمی لاٹھی لیے ہوئے

موجود تھے ۔ اتنے میں سامنے سے دو آدمی آگئے ۔ ان میں سے ایک شخص وہ تھا جس کو قتل کرنے کے ارادے سے یہ تینوں آدمی یہاں چھپے ہوئے تھے ۔ وہ آدمی جب وہاں پہونچا اور تین آدمیوں کو اسلحہ لیے ہوئے دیکھا تو اس نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ لوگ اس کو مارنے کے لیے آئے ہیں ۔ اس نے فوراً اپنے ساتھی کو آواز دی اور اپنا کرتہ اتار کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بلند آواز سے کہا : یہ کرتا لے جاکر میری ماں کو دیدے اور اس سے بول کہ میری قبر تیار رکھے ۔ اس نے بلند آواز سے یہ جملہ کہا اور پھر کھڑے ہوئے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا : تم میں سے جس کو آنا ہے میرے مقابلہ میں آئے ، میں تیار ہوں ۔ اس کے بعد تینوں میں سے کوئی شخص آگے بڑھنے کی ہمت نہ کرسکا ۔ سب خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے ـــــــ اکثر اوقات جرأت کا مظاہرہ ہی دشمن کو زیر کرنے کے لیے کافی ہوجاتا ہے ۔

بعض لوگوں نے کہا کہ اخبارات و رسائل میں آپ کے خلاف بہت لکھا جارہا ہے ، پھر آپ ان کا جواب کیوں نہیں دیتے ۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں میں قرآن کے اس اصول پر عمل کر رہا ہوں کہ : واعرض عن الجاهلين (نادانوں سے اعراض کرو) میں اپنے ان ناقدین کی چیزیں برابر پڑھتا رہتا ہوں ۔ مگر اب تک کوئی ایسی بات نہیں ملی جس کا جواب دیا جائے ۔ اب تک ہمارے خلاف چھپی ہوئی تمام تنقیدیں محض بے معنی الفاظ کے مجموعے ہیں نہ کہ حقیقۃً وہ چیز جس کو علمی زبان میں تنقید کہا جاتا ہے ۔ پھر آخر جواب دیا جائے تو کس بات کا جواب دیا جائے ۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے سفرناموں میں خودستائی (Self-praise) ہوتی ہے ۔ میں نے کہا کہ دو چیزیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں ۔ ایک ہے خودستائی اور دوسری چیز ہے بیانِ واقعہ ۔ الرسالہ میں جو چیز ہوتی ہے وہ بیانِ واقعہ ہے نہ کہ خودستائی ۔ اور بیانِ واقعہ میں کوئی بھی شرعی یا علمی قباحت نہیں ۔

۳ مارچ ۱۹۸۷ کی صبح کو میں واپس دہلی پہونچا ۔

خبرنامہ اسلامی مرکز۔ ۳۲

۱۔ بنگلور کی بک فیر (مارچ ۱۹۸۷) کے موقع پر اسلامی مرکز کا بک اسٹال لگایا گیا۔ خدا کے فضل سے اسٹال کامیاب رہا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں کتابیں دیکھیں اور حاصل کیں۔ تاثراتی رجسٹر میں بہت سے لوگوں نے اپنے تاثرات درج کیے۔ ایک صاحب نے اپنے تاثرات کے تحت لکھا: یہ کیسا عجیب معاملہ ہے کہ ایک عرصہ سے میں مختلف مصنفین کی کتابیں پڑھتا آیا ہوں۔ لیکن جب سے مولانا وحید الدین صاحب مدظلہ کی کتابیں پڑھنے لگا ہوں، سوائے آپ کے دیگر مصنفین کی کتابیں بے مزہ معلوم ہوتی ہیں (سید شہاب الدین، بنگلور)

۲۔ ایک اور صاحب نے اپنے بارہ میں حسب ذیل الفاظ قلم بند کیے:

I want to know about Islam in a philosophical way.
L.C. Reddy, Anuikshaki, Study Centre,
Aravinda Nagar, Bangalore 560084

۳۔ انگریزی الرسالہ میں اس سے پہلے سفرنامہ کا ترجمہ شائع نہیں کیا جاتا تھا۔ اب بعض لوگوں کی تجویز پر اس کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ قارئین کے درمیان بہت پسند کیا گیا ہے۔ انگریزی الرسالہ میں اردو سفرنامہ کا خلاصہ دیا جارہا ہے۔

۴۔ لندن میں ۱۴۔۱۶ اپریل ۱۹۸۷ کو ایک کتابوں کی نمائش (بک فیر) ہوئی۔ اس میں منتظمین کی طرف سے اسلامی مرکز کی بعض انگریزی کتابیں بھی برائے نمائش رکھی گئیں۔ اس موقع پر "بکس فرام انڈیا" کے نام سے منتظمین کی جانب سے سو صفحات کا ایک انگریزی کتابچہ چھاپ کر تقسیم کیا گیا۔ اس کتابچہ میں صفحہ ۳۸، اور صفحہ ۸۸ پر کتاب کا نام اور اس کا مختصر تعارف درج تھا۔

۵۔ نئی دہلی (مندر مارگ) پر ۹ مئی کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے نماز کے موضوع پر قرآن وحدیث کی روشنی میں درس دیا۔

۶۔ ۲۱۔۲۲ مارچ ۱۹۸۷ کو صدر اسلامی مرکز نے مراد آباد کا سفر کیا تھا۔ واپسی کے بعد اقبال احمد صاحب کا خط (۲۹ مارچ) موصول ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ دونوں ہی دنوں کی آپ کی تقاریر سامعین نے بے حد پسند کی ہیں۔ سب ہی نے بہت عمدہ الفاظ میں اپنی

پسندیدگی اور دینی معلومات میں اضافہ کا تاثر دیا ۔ آپ کی آمد اور آپ کی تقریروں اور نصیحتوں نے یہاں الرسالہ کے مشن کو عملی جامہ پہنانے میں بہت مدد کی ہے ۔

۷ ۔ ایک صاحب لکھتے ہیں : تین سال سے الرسالہ زیر مطالعہ ہے ۔ میں نے کئی بار چاہا کہ الرسالہ کے سلسلہ میں اپنے تاثرات آپ کو لکھوں ۔ مگر لکھنا ممکن نہ ہوا ۔ اس کی وجہ غالباً الفاظ کی کمی تھی ۔ انسان قطب مینار کو دیکھتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے کہ " بہت اونچا ہے " یہی انسان جب ایورسٹ پہاڑ کو دیکھتا ہے تو دوبارہ یہی کہتا ہے کہ " بہت اونچا ہے " حالانکہ دونوں کی اونچائی میں بہت فرق ہے ۔ لیکن انسان کیا کرے کہ یہ جاننے کے باوجود " بہت اونچا " سے زیادہ کوئی لفظ وہ کہہ نہیں پاتا ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں الفاظ اپنے معنی کو کھو دیتے ہیں ۔ راقم الحروف نے جب بھی الرسالہ کے بارہ میں قلم اٹھانا چاہا تو الفاظ اپنی حیثیت کھوتے ہوئے نظر آئے ۔ اس کو الرسالہ جس بلندی پر نظر آیا اس کو کوئی نام دینے کے لیے میرے پاس لفظ نہ تھا ۔ آج کل مسلم نوجوان عام طور پر جس ذہنی حالت میں ہیں اسی حالت کا آج سے تین سال قبل میں بھی شکار تھا ۔ حقیقت سے کوسوں دور میرا ذہن خواب کی دنیا میں تھا جہاں نظام اعلیٰ قائم کرنے ، باطل کو طاقت کے زور پر مٹانے ، اپنے قومی پچھڑے پن کے خلاف حکومت سے احتجاج کرنے کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا ۔ میرے نزدیک جہاد یہی تھا اور میرے رہنما اور اسلام کے حقیقی خادم وہی تھے جو مذکورہ بالا باتوں کو لوگوں تک پھیلا رہے تھے ۔ اور اس پر عمل کی ترغیب دیتے تھے ۔ نچلا بیٹھ جانا ، خاموش رہ جانا ، معاف کر دینا ، برداشت کر لینا یہ سب چیزیں میری نظر میں قوم کی موجودہ حالت میں زہر تھیں ۔ نومبر ۱۹۸۳ میں بہ سلسلہ ملازمت پٹنہ آیا ۔ برادرم اسلم جمالی صاحب اور برادرم کریم صاحب نے الرسالہ سے متعارف کرایا ۔ الرسالہ کی باتوں کو ذہن نے فوراً مان لیا ۔ الرسالہ کے مضامین میں سچائی نظر آتی مگر وہ کڑوی معلوم ہوتی ۔ مگر یہ مضامین میرے مفروضات اور جذبات کو ایک ایک کرکے مٹاتے اور گراتے چلے گیے ۔ کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی تھی ۔ الرسالہ بھی میرے لیے ایک دریافت ہے ۔ اس دریافت نے ذاتی طور پر مجھے اتنا ہی متاثر کیا ہے جتنا کولمبس کی دریافت نے دنیا کو (شاہ واصف امام)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name ....

Address ....

....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:
☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque
Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Name ....

Address ....

....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76 July 1987 No 128

इन्सान! अपने आपको पहचान

GOD ARISES

انسان اپنے آپ کو پہچان

پیغمبر انقلاب

Man! Know Thyself

رازِ حیات

اسلامی تعلیمات

خاتون اسلام

سوشلزم اور اسلام

تذکیر القرآن

اسلام اور عصر حاضر

اسلامی زندگی

عظمتِ قرآن

الاسلام

مذہب اور جدید چیلنج

اللہ اکبر

صراطِ مستقیم

MUHAMMAD
The Prophet of Revolution

MUHAMMAD
The Ideal Character

Tabligh Movement

ISLAMIC LITERATURE

In Contemporary Idiom
by Maulana Wahiddudin Khan

Our publications aim at presenting Islamic teachings in contemporary scientific idiom. Apart from over 60 books in Urdu, English, Arabic and Hindi, we publish two thought-provoking monthly magazines entitled *AL-RISALA* in Urdu and English.

Monthly *AL-RISALA* has two-fold aim: to introduce Islam as a divine message to all mankind: and to promote a positive and constructive thinking among the people.

Annual subscription: Rs. 48 (inland);
US $ 25 (abroad by airmail);
US $ 10 (by surface mail)

AL-RISALA CASSETTE

This series of lectures and talks recorded on cassettes aims at creating a spiritual awareness and stimulating constructive thinking.

Price per Cassette:
Rs. 25, US $ 5.

THE ISLAMIC CENTRE
C-29 Nizamuddin West,
New Delhi - 110013 (India)
Tel. 611128, 697333

Rs. 4